متاعِ فقر

(ڈاکٹر ذاکر حسین)

عابد رضا بیدار

رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز

سلسلۂ مطبوعات، ۳۰

۱۹۶۹ء

قیمت: بیس روپے

انتساب

عابد صاحب!

آپ نے جس عزم، صبر اور ضبط کے ساتھ ذاکر صاحب کا ساتھ نبایا، وہ تاریخ کا ایک امٹ حصّہ بن چکا ہے۔ آپ نے اُردو کے تہی دامن کو جس لگن کے ساتھ بھرنے کی کوشش کی، اور فلسفہ، تاریخ، ادبیات اور ہندیات میں تراجم کے ذریعہ اُردو والوں کو جو عالمی نظر بخشی ہے اُسے آنے والی نسلیں بھی شکر گزاری کے ساتھ یاد رکھیں گی۔ خود اُردو نثر کے اسلوب کو بُنیادی، معیاری اور علمی طرزِ گفتگو سکھانے میں آپ کا جو حصّہ ہے، اور آپ کے اپنے اسلوب میں بنیادی نثر ہونے کے باوجود جو حرکی عنصر ہے، اور جو شگفتگی ہے، اُسے ادب کا کوئی طالب علم آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

آپ نے ہندستانی قومیت کے مسئلہ پر اور ہندستانی مسلمانوں کی تقدیر کے بارے میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہ، آج نہیں تو کچھ دن بعد لوگ حرزِ جاں بنا کے رکھیں گے، اور فخر کے ساتھ کہا کریں گے کہ ہندستانی مسلمانوں نے اپنی گری پڑی حالت میں کتنا بڑا مفکّر پیدا کر دیا تھا۔ اور اُردو زبان دوسری تمام مہذّب زبانوں کے سامنے مغرورانہ آزاد ہندستان کی طرف سے کچھ پیش کیا کرے گی تو آندھی میں چراغ کی طرح آپ ہی کی دونوں کتابیں ہوں گی۔

علم اور درویشی کے ڈانڈے جس طرح آپ کی زندگی میں مل گئے ہیں وہ اسکالر شپ کی دُنیا میں ایک مثال کا کام دے گا، اور آئندہ جب کبھی لوگ اس وادیٔ بے آب و گیاہ میں قدم رکھیں گے تو کم سے کم ایک نقشِ کفِ پا چمک رہی اُٹھے گا جو انھیں دور تک روشنی بھی دے گا، ہمت اور توانائی بھی!

ذاکر صاحب عظیم تھے، عظیم کو عظیم ساز بنانے والے کس قدر عظیم ہوتے ہیں اس کا اندازہ تو کیا جاسکتا ہے، ان کا پتا آسانی سے نہیں لگ پاتا۔ آپ کو خاموشی اور لگن کے ساتھ اپنے کام میں مگن، لیکن خیالات و افکار کی کتنی بڑی دُنیا کو جنم دینے والے اُن سب درویش صفت عظیم سازوں کی ایک علامت قرار دے کے یہ ناچیز ترتیب آپ کے لیے نذر لایا ہوں۔

ذاکر صاحب ایک عظمت سے گزر کے دوسری عظمت تک پہنچ گئے۔ آپ اقبال کے مردِ قلندر رہنے اُسی جگہ جمے رہے جہاں سے سفر کا آغاز کیا تھا۔ میں ذاکر صاحب پر بھی فخر کرتا ہوں کہ میری کمیونٹی نے ایک اور ایسا آدمی پیدا کر دیا جس پر پوری قوم کو ناز ہوا اور جسے اس کے مخالفوں نے بھی ہندستان کے شریف ترین شہری کے نام سے پکارا۔ یہ عظمت، یونہی نہیں مل جاتی۔ لیکن اتنا ہی مجھے اس پر بھی ناز ہے کہ ہمارے درمیان دُنیوی عظمت کی طرف نہ کھنچنے والے آپ جیسے لوگ بھی موجود رہیں جو بس دلوں میں عقیدت کے چراغ جلاتے رہے ہیں۔ یہ بڑی خیال انگیز، دلچسپ اور مغرور بنا دینے والی بات ہے کہ جامعہ تحریک نے دو شخصیتیں پیدا کر دیں جن پر پورا ہندستان بجا طور پہ ناز کرسکتا ہے۔ دونوں فقر و درویشی میں بیس سال گزارنے کا عہد کرکے جامعہ میں جمے رہے۔ پھر آزادی کا سورج طلوع ہوا تو ـــــ قوم نے ایک سے مطالبہ کیا اور اس نے اسے قبول کر لیا، کہ اب وہ مسلمانوں ہی کے ایک بڑے ادارے کی سرداری قبول کرے جس میں زیادہ عزت، زیادہ شان اور زیادہ نمود اور زیادہ آسائش تھی۔ قوم کا مطالبہ اور آگے بڑھا۔ پہلے انھیں ایک ہندستانی ریاست کا قومی تاجدار بنا دیا گیا، پھر نائب صدر، اور بالآخر قوم کا سب سے بڑا اعزاز ان کے قدموں میں جھک گیا، اور وہ اتنی ہی سہولت سے ایک محل سے دوسرے عظیم الشان محل میں منتقل ہوتے رہے، جیسے قرول باغ کے ایک حقیر مکان سے اوکھلے کے ایک نسبتہً معقول مکان میں۔ وہ صدر جمہوریہ کی ٹرین اور صدر کے ہوائی جہاز میں آندھرا اور آسام،

لندن اور ماسکو، یہاں اور وہاں اسی طمانیت سے سفر کرتے رہے جس طرح
خوادے سے ادھلے جانے کے لیے ایک ایک گھنٹے بس کی راہ دیکھ کے بالآخر
اپنے گھر پہنچ پاتے تھے - اور نہ وہ شاہی میں فقر کے آداب بھولے نہ فقر کے دنوں
میں شاہی طنطنہ نے کبھی ان کا ساتھ چھوڑا تھا!

اور دوسرا، وہ تو جامعہ ہی میں بقیہ زندگی بھی گزار دینے کا تہیہ کر چکا تھا۔
آزادی کے بعد جامعہ بھی آزاد ملک کے آزادی خواہ ادارے کی حیثیت میں
ساری مستحق برکات سے نوازی جاتی رہی، لیکن حسرت موہانی کی شرع پر چلتے
ہوئے اندھیرے کا ساتھی اجالا ہوتے ہی چپکے سے کھسک لیا۔ اجالے کی برکتیں
دوسروں کو لوٹنے دو، مجھے اپنی سادہ سی رہائش گاہ، رفیق ہمسفر اور پرسکون مٹی
کائنات بہت ہے؛ کافی ہے۔ یہ فیصلہ کتنا مبارک فیصلہ تھا۔

جس طرح ایک نے براہ راست ملک کی ایک بہت بڑی تعداد کو اپنی شرافت
وشائستگی سے اور اپنے معیاروں سے متاثر کیا، اسی طرح دوسرے نے خاموشی
کے ساتھ ہندستان کے ایک بہت بڑے دانشور طبقہ کو مسلسل اپنی فکر و دانش سے متاثر
کیا، یہ بحث کہ ان میں کون عظیم تر ہے دشوار بھی ہے فضول بھی۔ ذاکر صاحب کے ایک
اور عزیز دوست یہاں مجھے یاد آرہے ہیں، جنھوں نے ایک بار مجھے ایک بے حد قیمتی
اپدیش دیا تھا اور جسے میں نے اب تک حرز جاں بنا کے رکھا تھا، آج جی چاہ رہا ہے کہ اس
موقع پر اسے میں ان سطروں کو پڑھنے والے دوستوں میں بانٹ دوں۔ یہ رشید صاحب نے کہا
تھا کہ "بڑائی منصب سے نہیں ہوتی، بڑائی ذمہ داری کے بڑے چھوٹے ہونے سے بھی نہیں
ہوتی، دراصل ہم میں سے ہر شخص کو کوئی نہ کوئی مشن ملا ہوا ہے، کسی نہ کسی کام کے لیے
مامور ہوا ہے، عظمت اس میں ہے کہ وہ اس مشن کو کیسے اور کس طرح انجام دے رہا ہے۔
گاندھی جی زیادہ عظیم ہوں۔ میں اور آپ ان سے کمتر ہوں، ایسی بات نہیں ہے۔ میں اور آپ
بھی اتنے ہی عظیم ہو سکتے ہیں جتنا کوئی بھی عظیم ترین بس شرط اتنی ہے کہ ہم اپنے مشن کو پہچان
لیں، اور اس مشن کو پورے جذبۂ خلوص اور لگن کے ساتھ انجام دینے میں لگ جائیں۔"
مشن کی پہچان ہی مشکل ہے، اس پر یقین اور بھی دشوار! اور پھر اس کو انجام دینے کا مرحلہ

کیسا دشوار ترمرحلہ ہے، جس سے کتنے عہدہ برآ ہو پاتے ہیں !!

عابد صاحب بڑے رسان سے عشق کی ہیجان کے مرحلے سے بھی گزر گئے اور اس کی انجام دہی سے بھی۔ کم لوگ ہوں گے جنھوں نے اس سکون و طمانیت اور ایسی ثبات سے ان دشوار تر مرحلوں کو طے کر لیا ہو۔ تصوّف کی بھول بھلیوں میں پھنسے بغیر بھی کوئی شخص اس ہیجان و اضطراب میں مبتلا ذاتی اور گرد و پیش کی اس بھری پُری مشینی دنیا میں اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے اپنے کو رسان سے نکال لے جائے ـــــ یہ اس کا کتنا بڑا کریڈٹ ہے۔

جی چاہتا ہے جس طرح میں نے ذاکر صاحب کو دل کے مندر میں بُت کا درجہ دے لینے سے بال بال بچا لیا ہے، اسی طرح کوئی عابد صاحب کے بارے میں مجھے کچھ نہ کچھ ضرور بتا دے، تاکہ بُت سازی پر حریص یہ نادان دل اس بار بھی شرک سے بچ جائے!

عابد رضا بیدار

ترتیب

پیش گفتار

ذاکر صاحب نے ایک موقع پر کہا تھا:

"جن چیزوں کی بعض دفعہ بظاہر بہت چھوٹی چھوٹی باتوں کی تحقیق میں یہ اہلِ علم سر کھپاتے ہیں وہ باہر والوں کو حقیر معلوم ہوں مگر سچ یہ ہے کہ ان کے کام کا بڑا اہم جز ہیں۔ جب کوئی شاعر یا ادیب یا مورخ یا مدبر ایسے بلند مرتبے کو پہنچ جاتا ہے ..... تو پھر ہر چھوٹی بڑی بات مستحق توجہ ہو جاتی ہے اور تحقیقی کام کے سبھی آداب ہر جزئیہ میں ملحوظ رکھنے ہوتے ہیں۔"

ایک بات تو یہ ہوئی؛ اب آگے بڑھیے:

"مگر شاعر پر توجہ کا ایک اور بڑا میدان خود اس کا شعر ہے، قطع نظر اس کے کہ اس کے استاد کون تھے اور نانی کا حال معلوم ہے یا نہیں یا ماموں کے متعلق سب تفصیلیں جمع کر لی گئی ہیں یا نہیں؛ اس لیے کہ میرے خیال میں شعر ایک مستقل وجود رکھتا ہے، شاعر سے الگ!"

تو تحقیقی کام کو تو میں فی الحال آئندہ کے لیے اٹھا رکھتا ہوں؛ سر دست شاعر کے شعر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں سے کئی ایک تو شاعر کی بیاض میں بھی محفوظ نہیں رہ گئے، اور کئی ایک نسخۂ حمیدیہ کا درجہ پا چکے تھے۔ لیکن ان میں کوئی ایسا نہیں جو شاعر سے شرمندہ ہو یا شاعر اس شعر سے!

یہ ایک طور سے ذاکر صاحب کے ذہنی سفر کی داستان ہے۔ ایک ذہنی زندگی کی خود نوشت جو مصنف زندگی کے مسطر پر لکھتا چلا گیا ہے۔ زمانہ طالب علمی کی تحریر یعنی ذاکر صاحب کی پہلی 'معلوم' مطبوعہ تحریر سے اس سلسلہ کا آغاز ہوتا ہے جو مجھے لکھنؤ کے اُس زمانے کے رسالہ الناظر سے ملی ہے۔

زندگی کی پہلی تحریر کوئی افسانہ نہیں ہے، مزاحیہ مضمون نہیں ہے، ترکوں کا قصیدہ

نہیں ہے، دنیا کے امن و جنگ پر کوئی تبصرہ نہیں ہے: اسلام زندہ باد، یا ہندوستان زندہ باد نہیں ہے: یہ بابی مذہب کو براؤن کی مبسوط تاریخ کی روشنی میں، اردو میں پہلی بار معروضی انداز پر پیش کرنے کی کوشش ہے: گویا دوسروں کے نظریات و افکار کو پُرخلوص طریقے سے سمجھنے کی ایک سعیِ مشکور۔ اسی مذہب سے ساحرہ اور شاعرہ قرۃ العین بھی وابستہ تھی: رومانوی مضمون نگار کے لیے ایک مزید باعثِ کشش نہیں!

تین چار سال بعد افلاطون سے دلچسپی شروع ہو جاتی ہے اور علی گڑھ میگزین میں اس دلچسپی کے نتائج بھی سامنے آنے لگتے ہیں، تا آنکہ علی گڑھ سے بغاوت، یورپ کا قیام اور پھر جامعہ کے لیے اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دینے کی منزلیں طے ہو جاتی ہیں۔ جامعہ زندگی کا مشن بن جاتی ہے، لگتا ہے: "اب کچھ بھی نہیں تیری محبت کے سوا یاد" لیکن نہیں: ذہن کے کسی گوشے میں عدلی جمہوریہ "آئیڈیل ریاست" کے خالق افلاطون سے دلچسپی چلی آرہی ہے جس نے ان سارے ہنگاموں کے باوصف انھیں اسیر کر رکھا ہے، اس لیے کہ یہ ان کا اپنا آئیڈیل ہے، صدیوں پہلے گزرا ہوا ان کا اپنا ایگو: ہر عقلمند انسان کو اپنا مشن معلوم ہوتا ہے: ذاکر صاحب کو بھی معلوم تھا آزاد ہندوستان میں ایک نئی جمہوریہ کے تشکیلی دور میں افلاطون نے ایک عالم باعمل صدرِ ریاست ان کے اندر پا لیا ہے، ورنہ آخر یہ سب کچھ کیا تھا! اگر انھوں نے اردو شاعری کی تاریخ نہیں لکھی، اسلامیاتِ ہند پر کوئی تھیسس نہیں لکھا، زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے کوئی مبسوط فکر پیش نہیں کی، کیا تو یہ کہ اتنی ساری بھاگ دوڑ کے اندر بھی ۱۹۳۲ء تک انھوں نے اپنے محبوب مصنف کی کتاب کو بالآخر اردو میں منتقل کر دیا۔ اب آپ ذرا دیکھیے تو پوری کتاب میں جاری و ساری روح کو چھوڑئیے، خود مقدمۂ کتاب کی ان منتخبہ سطروں میں ذاکر صاحب کہاں کہاں مضمر نہیں آرہے ہیں!

چند سال بعد ۱۹۳۹ء میں وہ یورپ علاج کے لیے جاتے ہیں، لیکن وہاں سے جو خط لکھتے ہیں ان میں وہ ہمیں ایک وارستہ مزاج کے سوا کچھ نظر نہیں آتے۔ رسک لینے رہنے کا ایک ایسا شاندار، بے جھجک، بے جھجک اظہار جیسا اس شخصیت میں ہوتا رہا، قدرت کی بنائی ہوئی کسی دوسری آدم کی صورت میں کم ہی ہوا ہوگا۔ اس خط میں تو بس ایک جھلک ہی ہے؛ جو آپ کی قوتِ متخیلہ کی آزمائش کر کے مثلاً علی گڑھ سے جامعہ، دہلی سے جالندھر اور بالآخر نائب صدارت سے صدارت کے الیکشن تک تین انتہائی خطرناک پُل صراط سامنے لا کھڑا کرتی ہے، اور آخری تحریر اس کی توثیق یا تتمہ ہے کہ: سچ سچ انھوں نے زندگی کو حسابی طور پر

گزارنے کی کوشش کبھی نہیں کی، نہ اس کی کہ یہ کام کوئی اچھا سمجھے گا یا بُرا۔ بس کام سے غرض تھی؛ اور کام ان کے پاس آتے گئے، وہ کاموں کے پاس نہیں گئے! اور پھر کبھی کسی بھی جگہ اس سمیٹ کے گزر جانے کی کوشش نہیں کی، نہ کسی کام کو بیگار سمجھا۔ کام زندگی بنتا گیا، پھر زندگی بیگار کیسے ٹالی جاتی؛ کام زندگی بنتا گیا اس لئے اس کو اہمیت دینے، یا اپنے کو اہمیت دینے کا بھی کیا سوال اُٹھتا! اپنی زندگی تھی اپنا کام تھا؛ بس شرافت، شائستگی اور آہستگی کے ساتھ سب کچھ ہوتا چلا گیا؛ جامعہ کی چمن بندی، علی گڑھ کی تنظیم نو، نئی دہلی کا ایوان صدارت ——— سب کچھ بالکل قدرتی طور سے، جیسے سانس لینا! ان کی 'یہ اپنے بارے میں' زندگی کی آخری تحریر یا تقریر تھی جو نذرِ ذاکر کی پیش کش کے موقع پر انتقال سے ٹھیک ایک سال پہلے راشٹرپتی بھون کی متعلقہ تقریب میں کی تھی۔

اس خود گفت یا خود نوشت سوانح کا اگلا حصہ محض ان لوگوں کے احوال پر مشتمل نہیں ہے جن سے ذاکر صاحب سب سے زیادہ متاثر ہوئے: اجمل خاں، انصاری، حسرت، نہرو، حالی (چند ایک اس میں نہیں بھی ہیں، مثلاً محمد علی، گاندھی اور آزاد) افلاطون کی طرح یہاں بھی غیر محسوس طور سے اپنی ہی بوقلموں تصویریں ہیں، انتہائی ناقابلِ یقین لیکن انتہائی یقینی طور سے اتنی ہی سچی، خود ان کی اپنی تصویریں!! خاص کر اجمل خاں کو دیکھئے، بس چند جگہ معمولی لفظی ترمیم کی ضرورت پڑے گی!!

اس کے بعد بہت خوبصورت اور بے حد مختصر کینوس پر ذاکر صاحب کی زندگی کا فلسفہ

اُنکی ایک عمر کی فکر کا حاصل اور نچوڑ۔ بدنصیب وطن کی پکار، نئے آدم کی تلاش، شخصیت کی تعمیر اور اقدار کی چاکری کے ذیل میں آگیا ہے۔

پھر جس طرح دلوں کو جوڑنے والی زبان اُردو سے انھوں نے محبت . . . کی، وطن کی محبت کو حالی کی طرح جس طرح انھوں نے سمجھا؛ جنون و غارتگری کے دور میں جس طرح بھائیوں، دوستوں، ساتھیوں کو پکارتے رہے، مسلمان کو ہندستان کی اور ہندستان کو مسلمان کی پہچان کراتے رہے، جامعہ اور علی گڑھ کو ایک قدر بنائے پیش کرتے رہے، یہ سب ان کی بے حد INTEGRATED شخصیت کے بھرپور پہلو پیش کرتے ہیں، اور یہ سب مل کر ہی ان کے ذہنی سفر کی اس داستان کو مکمل کرتے ہیں جو علی گڑھ کالج سے شروع ہو کر صدر کے ایوان تک جاری رہی!! انھیں مختلف موضوعات پر ذاکر صاحب کے مقالات سمجھ کے [illegible] جائے گا، یہ دیکھتے چلئے گا کہ خود ذاکر صاحب [illegible] کس طرح اپنی داستان

رقم کرتے چلے جاتے ہیں۔

ایک طور سے یہ ذاکر صاحب کی بطور ایک صاحبِ طرز نثر نگار کے بھرپور اسٹڈی ہے: سولہ سترہ سال کے ایک طالب علم کا قلم کس طرح لکھتا تھا؛ سولہ سترہ سال اور اس کی زندگی میں جُڑ گئے تو وہ کس طرح لکھتا تھا؛ پھر سات سال اور؛ اور بالآخر، جب موت ایوانِ صدر کی چوکھٹ کو چوم چوم کے ایک سال بعد آنے کو کہہ کہہ جاتی تھی!

پھر، جن اشخاص سے یہ شخصیت متاثر ہوئی ان پر کس انداز سے قلم اُٹھتا تھا: اجمل خاں، انصاری، حسرت، نہرو۔

پھر، جو ان کے محبوب موضوعات تھے شاید ان کا حسن بھی تھے؛ ان پر ذاکر صاحب کس طرح لکھتے تھے: وطن کی پکار، آدم کی تلاش، شخصیت کی تعمیر اور اقدار کی بپا کری۔

پھر، اس مظلوم زبان کے بارے میں لکھتے وقت قلم پر کیا کچھ بیت جاتی تھی، "جو میں نے پہلے پہل اپنی ماں سے سیکھی تھی، جس میں میری ذہنی پرورش ہوئی، جس میں میں اب تک سوچتا ہوں"، جس میں وہ مضمون لکھتے تھے، کہانیاں لکھتے تھے؛ جس کے عظیم المرتبت شاعر کی صدی ان کے دورِ صدارت میں منائی گئی جس سے سیکولرزم کا سبق سیکھا جا سکتا ہے، جس کے عزیز شاگرد حالی سے حُبِ وطن کی صحیح قدریں سیکھی جا سکتی ہیں۔

پھر، بدنصیب ملک کی بدنصیب سیاست کو شدھ کرنے کی بات ایک معلم کے دماغ میں کس طور پر آتی تھی۔ وحشیوں کی روداد کو کس طرح تہذیبوں کی روداد میں تبدیل ہوتا دیکھنا چاہتا تھا، بربریت کے طوفان میں کس طرح انسانیت پر غیر متزلزل بے لچک ایمان و ایقان رکھتا تھا ——— اور ان موضوعات پر کیسے ہلچل کے لکھتا تھا۔ لیکن ہلچل کے لکھنا دراصل اگلے حصے کے لئے استعمال کرنا زیادہ زیب دیتا ہے جو ہندوستانی مسلمانوں پر ہے، یا پھر انھیں کے دو محبوب اداروں جامعہ اور علی گڑھ پر ہے۔

آخر میں، اس صاحبِ طرز نثر نگار کو آپ خود اپنی نظر سے مطالعہ کرنا چاہیں تو میرے دوست جمیل قریشی کی مرتبہ ببلیوگرافی آپ کی مدد کر سکتی ہے۔ دو سال کے قریب ہوئے میں نے اپنی ایک ترتیب میں آٹھ دس دوسرے لکھنے والوں کے ساتھ ذاکر صاحب کی تحریریں بھی شامل کی تھیں، اس کا عنوان تھا "نثر کا حسن: میرے عہد کے صاحبِ طرز نثر نگار"، دیکھ کر کہنے لگے "ان لوگوں کے ساتھ آپ نے مجھے بھی لے لیا، میں ادیب ہی کہاں کا ہوں، اور آپ نے تو صاحبِ طرز بھی بنا ڈالا!" میں نے کہا یہ تو حقیر سا دعویٰ تھا، تفصیل تو آ رہی

ہے، پہلے کاغذ پر موجودہ کتاب کی کتابت میں نے دکھائی تو خوش ہو کے بولے: "تو یہ آپ دھمکی دینے آئے ہیں! بلکہ مجھے بشارت کہنا چاہیئے!" واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تک موجودہ کتاب کی نوعیت اتنی ہی تھی جو میں نے ذاکر صاحب کو بتائی تھی یعنی ایک صاحب طرز نثر نگار کے سارے اہم دلآویز نمونے! اس کی یہ حیثیت اب بھی برقرار ہے، لیکن ایک پہلودار شخصیت کے کلام میں متعدد پہلو نکلتے چلے آئیں تو میں کہاں کہاں حد بندی کر سکتا ہوں۔ اتنا خوبصورت بے میل اسٹائل، جس میں شخصیت کی ساری گرمی اور توانائی گھل کے در آئی ہو، اُردو میں دوسری جگہ نہیں ملے گا۔ ان کا اسٹائل ظاہراً انگریزی انداز کے جملۂ معترضہ، حرف بیانیہ اور اسی قسم کے اوقاف کی مدد سے جوڑوں اور توڑوں پر مشتمل ہے، جس میں تیسرے درجے کے الفاظ مثلاً پچانا، اگوا، وغیرہ کا بھی نہایت خوبصورت استعمال ہو گیا ہے۔ ان کے یہاں تو سلیج زبان کے بے شمار پہلو ملتے ہیں، وغیرہ وغیرہ لیکن کیا بس اتنا ہی:

یہاں تو سراپا درد شخصیت محلول ہوئی ہوتی ہے۔ یہ دردمندی اور گھلاپٹ نا، یہ کہاں ملے گا؟ میں نے ۱۹۶۲ء میں جب پہلی بار ذاکر صاحب کا ایک انتخاب شائع کیا تھا تو اس کا عنوان تھا: "دل کے خون سے لکھی ہوئی تحریریں"، کہ یہ شخص ہمیشہ دل کے خون سے لکھتا اور بولتا تھا۔ آپکو معلوم ہے جب دل کے مرض کا پہلا دورہ پڑا تھا تو پھر ڈاکٹروں نے انھیں تقریریں کرنے سے روک دیا تھا۔ لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس کا سبب یہی تھا کہ ایک ایک لفظ دل کے خون سے سیراب ہو کے زبان تک پہنچتا تھا، اس سے پہلے نہیں۔ (عابد صاحب نے بھی اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔) ذاکر صاحب حلق سے بولنے پر کبھی سکت نہ پا سکے۔ کاش انھیں سنتے وقت میری طرح آپ بھی ان کی آواز کے ارتعاش کی گرفت کر سکے ہوں، جو صرف دل والوں کا ہی حصہ ہوتا ہے۔

ایک لحاظ سے یہ قومی تہذیب اور ہندستانی مسلمان کے رشتے کو سمجھنے کی ایک بڑی لطیف کوشش ہے، ایک ایسے شخص کے قلم سے جو دنیا کی اس سب سے بڑی جمہوریہ کا صدر چنا گیا تو اس نے کہا:

"میں اپنے ماضی کی تہذیب سے وفاداری کا حلف اٹھاتا ہوں،

ماضی کی تہذیب، جو کسی بھی سمت سے آئی ہو۔ کسی بھی ذریعہ سے آئی ہو!

میں اپنے ملک کی اس تہذیب کی اس کی مکمل شکل میں، خدمت
گزاری کا حلف اٹھاتا ہوں۔"

قومی تہذیب کو ہندستانی اسلام اس گری پڑی حالت میں بھی کیا کچھ تحفے نہیں دیتا جا رہا ہے!۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!!

پر، میرے لیے تو اس کی بس ایک ہی حیثیت ہے: آگے نہ جانے کیا منزلیں آتی ہیں۔ ابھی تو اپنی کُل کائنات یہی ہے۔ لگتا ہے۔ فقیر کی جھولی میں اس کے سوا کوئی متاع ہے ہی نہیں:

نئے ہندستان کے لئے ایک دلآویز نقشے کی تعمیر جس میں:

"ہے رنگِ لالہ و گل و نسرین جدا جدا ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے"

"جہاں ہر جزو دوسرے جزو کی رونق کو چمکائے اور ایک حسین و جمیل کل کی تشکیل میں مدد دے۔"

اور۔۔۔ جہاں اپنے شہریوں کے جائز حقوق کو پورا کرنے، ان کے جذبات کا احترام کرنے، ان کو سہولتیں پہنچانے سے، ان کی عزیز اور جہیتی چیزوں کی حفاظت اور ترقی میں ان کی مدد کرنے سے "وحدت قومی" ہر شہری کے اندر سے اُبل پڑے، کہ جذبۂ قومی ایک زندہ کارفرما جذبہ ہے، وفاداری ایک ذہنی وابستگی ہے؛ اس کے مطالبے نہیں کیے جاتے، اس کے ثبوت نہیں مانگے جاتے، ساری قومی زندگی کی خوش نیتی اور خوش عملی، منصفانہ خوش معاملگی اور برادرانہ رواداری اُسے بے تحاشا فطری کیفیت کی طرح ہر شہری کے ذہن میں رچا دیتی ہے" جس کے بعد فرقہ وارانہ وفاداریوں کو نکھار کے انھیں "حدتِ قومی کا دلدادہ بنانے" میں مشکل نہیں پڑتی۔

پھر اطمینانِ خاطر کے ساتھ ہر فرد یکسوئی کے ساتھ اپنے مشن کی دریافت میں لگ جاتا ہے۔ "اعلیٰ اقدار کی سطوا" میں لگ کر اپنی "شخصیت کی تعمیر" کے مواقع کھوجنے میں اسے سہولت ہو جاتی ہے، وہ سمجھنے لگتا ہے کہ "زندگی مشن ہے۔ زندگی خدمت ہے، زندگی عبادت ہے" اور یہ کہ "جو آدمی اپنی سوسائٹی کو اسی حالت میں چھوڑ دیتا ہے وہ اس کا غاصب ہے، ہر اچھا آدمی مرنے سے پہلے سوسائٹی کو اس سے بہتر حالت میں چھوڑتا

ہے"۔ پھر اس کے اندر ایک نیک کام میں INITIATIVE لینے کی بے پناہ اخلاقی قوت آجاتی ہے۔ جب وہ کسی کی آواز سنتا ہے کہ "پرانی ڈگر کو چھوڑ کر نئی راہ پر چلنا ہمیشہ دشوار ہوتا ہے۔ محتاط لوگ جھجکتے ہیں، کم حوصلہ لوگ ٹھٹھکتے ہیں؛ کوئی ہمت والا آگے بڑھ نکلتا ہے تو یہ پیچھے پیچھے ہو لیتے ہیں"۔ اور پھر اس اعتماد کے ساتھ جو اقبال ہی کے کسی ہم سخن کے یہاں مل سکتا ہے "تعمیرِ خودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ" کا انداز اختیار کر کے آسمانوں کی طرف ہاتھ بڑھا دیتا ہے:

"دُنیا کا ہر ذرّہ جواب دینے کے لئے تیار ہے، بشرطیکہ کوئی سوال کرنے والا ہو۔ تمام دروازے کھلنے کے لیے بیتاب ہیں، بشرطیکہ کوئی انھیں کھٹکھٹانے والا ہو!"

اس میں جغادری مفکروں کے لیے کوئی بڑا فلسفہ، پرپیچ فکر، یا مربوط فکر شاید نہ ملے، لیکن مجھ جیسے بدیدوں کے لیے تو:

دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

اور — میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر

خاموش کھڑا ہوں ساحل پر، کہ اس دریا کی تھاہ کہاں ہے! کہاں ہے!!

مجھے مربوط فکر سے زیادہ ایسے FLASHES کو پڑھنے میں لطف آتا ہے، جو میری فکر کو مربوط تر کرنے میں مدد دیتے چلے جاتے ہیں۔ شاعری اسی لیے فلسفہ سے زیادہ اثر انداز ہے۔ اقبال، غالب اور ذاکر حسین اسی لیے ہمیں عزیز تر رہیں گے کہ اگرچہ ان کے کلام میں تسلسل کے ساتھ ایک مربوط فکری نظام کے تانے بانے نہیں بنے گئے ہیں، لیکن خود ہم میں سے ہر فرد کو وہ اپنی اپنی جگہ پر اپنا اپنا فکری نظام مربوط کرنے میں بے اندازہ مدد بہم پہنچاتے ہیں۔

سوانح

(مورث اعلیٰ حسین خاں آفریدی محمد شاہ کے عہد میں (۱۷۱۹ء - ۱۷۴۸ء) ہندستان آئے اور بنگش نواب محمد خاں نے فرخ آباد کے جوار میں اپنے بیٹے قائم خاں کے نام پر پٹھانوں کی جو نئی بستی قائم گنج بسائی تھی وہاں آکر آباد ہوئے۔ اس کے بعد سلسلہ اس طرح چلا: احمد حسین خاں۔ محمد حسین خاں۔ غلام حسین خاں۔ فدا حسین خاں[۱]۔

فدا حسین خاں ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۶ء میں انتقال ہوا۔ یہ ذاکر صاحب اور ان کے ۶ بھائیوں کے باپ تھے مظفر حسین[۱] خاں، عابد حسین[۲] خاں۔ ذاکر حسین[۳] خاں۔ زاہد حسین[۴] خاں۔ یوسف حسین[۵] خاں، جعفر[۶] حسین خاں۔ محمود حسین خاں۔

جعفر حسین خاں دو سال کی عمر میں ہی چل بسے تھے، اس لیے اصل میں چھ بھائی سمجھنا چاہیئے۔ عابد حسین خاں اور زاہد حسین خاں علی گڑھ میں طالب علم تھے کہ نوجوانی ہی میں تپ دق میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔ سب سے بڑے بھائی مظفر حسین خاں حیدرآباد میں اسپیشل مجسٹریٹ ہو گئے تھے اور ۲۷ سال کی عمر میں انتقال ہوا، ایک لڑکی اور اختیار حسین خاں اور مسعود حسین خاں دو لڑکے ان کی یادگار ہیں۔ تین بھائی بچے: تیسرے، پانچویں اور ساتویں۔ مورث اعلیٰ نے اپنے دیس سے آکر معلمی کا پیشہ اپنایا تھا۔ ان کے ان تینوں نامور اخلاف نے بھی معلمی ہی میں نام پیدا کیا۔ وہ معلمی میں اپنی چھوٹی سی بستی کے مخدوم بن گئے تھے، یہ تینوں اپنے اپنے دائروں میں بلند مدارج پر پہنچے: ایک دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا صدر بنا، دوسرا دنیا کی سب سے

۱۔ علیگڑھ میگزین ذاکر نمبر: "یادوں کی دنیا"

بڑی اسلامی مملکت کا وزیر، اور تیسرا مسلمانوں کی عظیم درس گاہ کا
پرو وائس چانسلر!

چھٹن خاں (غلام حسین خاں) کے پوتے، نازنین بیگم اور فدا حسین خاں کے تیسرے بیٹے[1] "فخر خاندان" کے حالات خود انہیں کی زبانی سُنیے، ایک معلم کی کہانی "جس نے کوئی ۴۷ سال پہلے طے کیا کہ اپنی زندگی کے بہترین سال قومی تعلیم کی نذر کر دیئے"[2] . . . . یوں تو

میرے اندازے سے تو یہ ساری کی ساری ترتیب ایک لحاظ سے ایک قسم کی خود نوشت ہی ہے؛ لیکن وہ جو عام طور پر سوانح حیات کہی جاتی ہے تھوڑی سی وہ بھی ضروری ہی ہوتی ہے۔ پر وہ بھی دوسروں کی بجائے خود اپنی زبان ہی سے دل کو لگتی ہے۔ پہلی بار انھوں نے علی گڑھ چھوڑنے کے بعد، اپنی عزیز دانش گاہ سے نکلنے والی تیسری نسل کو اپنی کہانی اس طرح سنائی تھی، یہ جنوری ۷۵ء کی بات ہے:۔)

میرے لیے اس دانش گاہ (علی گڑھ) سے وابستگی کی یاد ہی سب سے بڑا انعام ہے . . . . . مجھے اوروں سے کسی طرح کم نہیں، بلکہ کچھ زیادہ ہی اس کا موقع ہے کہ یہ آزاد ہندستان کی ذہنی اور روحانی قیادت میں اوروں سے آگے رہے . . . .

میرا دھیان اس وقت اب سے ۴۴ برس پہلے کی اس گرم دوپہر کی طرف رہ رہ کر جاتا ہے جب میں پہلی بار اس دانشگاہ میں پہنچا تھا . . . . مجھے یاد ہے بھائی صاحب مجھے کچی بارک کے کمرے میں چھوڑ کر اپنے دوستوں سے ملنے چلے گئے تھے، اور مجھے بتا گئے تھے کہ مغرب کے بعد جب گھنٹی بجے تو ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے چلے جانا۔ گھنٹی بجی میرے اندازے سے ذرا پہلے۔ میں نے ترکی ٹوپی، ترکی کوٹ اور جراب اور انگریزی جوتے پہنے بغیر کھانا کھانے کی مشق ۱۶ برس تک بہم پہنچا چکا تھا، یہ نئی وردی پہننے میں دیر کی . . . جب کس بندھ کر کمرے سے نکلا تو دیر ہو چکی تھی، اور دوسرے زیادہ چوکس ساتھی ڈائننگ ہال میں جا چکے تھے . . . .

یہ اس دن کی یاد اس تفصیل سے کیوں آ رہی ہے۔ آج؟ شاید اس لیے کہ

---

[1] صدر کا منصب بہ انتخاب کے بعد۔ [2] ایس۔ ایس۔ ہال

وہاں سے وہ زندگی شروع ہوتی ہے جس نے ۴۴ برس میں بہت سے رنگ دیکھے، مگر جس میں اس دانشگاہ سے برابر دل کو تعلق رہا، گہرا تعلق، نہ ٹوٹ سکنے والا تعلق یہاں بہت کچھ سیکھا، اور زیادہ نہ سیکھنے پر دلگیر ہونا سیکھا۔ ساری زندگی کو یہاں کے انتظام کا نتیجہ بنانے کا ولولہ یہیں سے پایا۔ یہاں دوست پائے، دوستی کی قدر پہچانی، مل جل کر کام کرنا سیکھا، اختلاف کے باوجود نباہ کے ڈھنگ سیکھے، بھانت بھانت کی زندگی کے نمونوں کو برتنا اور پرکھنا سیکھا؛ اپنی قومی زندگی کے سارے عیب یہاں برملا دیکھے پر اس کے پیچھا دے سے اپنی آنکھیں بھی نم پائیں۔ اس کی ساری آرزوؤں اور تمناؤں کا نقش بھی یہیں اپنے دل میں ابھرتا ہوا محسوس کیا۔ اپنی خام تند مزاجیوں اور بیجا بدگمانیوں پر نادم ہونا سیکھا۔ سوکھے پتوں کی طرح ایک چنگاری سے شعلے کی طرح بھڑک اٹھنے کو کچے کوئلے کی طرح سلگتے رہنے کا سبق بھی یہیں سے ملا، بھلی صفتوں کی چھپی کونپلوں کو نشوونما دے سکنے کے لیے ان میں زندگی کی تیز اور تند ہواؤں سے بچانے کی حکمت، مگر سیرت کی تعمیر کے لیے جماعتی زندگی کی ریل پیل میں مردانہ وار شامل ہونے کی ضرورت بھی یہیں پہچانی۔ خلوت و جلوت کی جدا جدا تعلیمی اور تربیتی تاثیروں کا یہیں پہلی بار تجربہ کیا۔ یہاں فرمانبرداری سیکھی، اطاعت شعاری سیکھی، ادب سیکھا، بڑوں کا ادب، ہم چشموں کا ادب، چھوٹوں کا ادب، خود اپنا ادب!

سعادتمندی اور وفاشعاری کے ساتھ خود اختیارانہ اس علمی بستی کے نظام کی پابندی کو عین آزادی جانا، جب اس نظام کو ضمیر کے مطالبوں سے ٹکراتا پایا تو اس سے بغاوت کی طاقت بھی اسی چشمۂ حیات سے ارزانی ہوئی۔ باغی بنے، نکالے گئے، دوسری بستی بسانے میں ایک ادنیٰ حصہ کا شریک بنے، مگر اس مادر علمی کی طرف سے کبھی کوئی کمی محسوس نہیں کی، ہر یاس میں بھی دل اسی میں اٹکا رہا۔

حالات بدلے، ملک آزاد ہوا، یہاں کا نظام بھی بدلا: فرزندانہ حیثیت سے اس کی خدمت کا موقع میسر آیا، بڑی بھلی جو بن پڑی خدمت کی۔ اور امید تھی کہ عمر بھر کی سرگشتگی کے بعد سر شوریدہ کو یہیں بالین آسائش نصیب ہو جائے گی، مگر یہ نہ ہونا تھا!

(تعلیم: اٹاوہ مسلم اسکول سے اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ ۱۹۱۳ء
۱۹۱۳ء۔۔۔ ۱۹۱۵ء انٹرمیڈیٹ علی گڑھ کالج، ۱۹۱۵ - ۱۹۱۷ء بی اے علیگ)

۱۹۱۶ء — ۱۹۱۸ء بی۔ اے (انگریزی ادب، فلسفہ اور معاشیات)

۱۹۱۹ء میں ایم۔ اے (پولیٹکس)

۱۹۲۰ء میں علی گڑھ سے بغاوت۔

۱۹۲۲ء میں برلن (سوا تین برس عابد صاحب کے ساتھ) جہاں زومبارٹ استاد اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے نگراں؛ لیکن اصل فیضان بقول خود کو سنٹائنر سے (نورانی) اور اشپرانگر سے (بقول عابد صاحب)

فروری ۱۹۲۶ء میں ہندوستان واپس

۱۹۲۷ء میں حکیم اجمل خاں کی وفات کے بعد جامعہ ملیہ کو چلانے کے لیے انجمن تعلیم ملی؛ ۲۸ نومبر ۴۸ء میں علی گڑھ کی وائس چانسلری کا چارج؛ ۱۹۴۹ء میں پہلا دورۂ قلب؛ ۱۹۵۶ء میں علیگڑھ کو ہمیشہ کے لیے الوداع؛ ۵۷ء میں گورنر بہار؛ ۱۹۶۲ء میں نائب صدر؛ مئی ۶۷ء میں...... صدر جمہوریۂ ہند۔ ۳ مئی ۶۹ء کو آخری سفر

○

(دسمبر ۱۹۶۶ء میں شبستان اردو ڈائجسٹ نے ایک نیک کام کیا!

ذاکر صاحب کا انٹرویو لے کر اپنے اولین شمارے میں شائع کر دیا۔)

میں قائم گنج ضلع فرخ آباد کا رہنے والا ہوں، لیکن میری پیدائش ۱۸۹۷ء میں آج سے ۶۹ سال قبل حیدر آباد میں ہوئی تھی۔ مجھے تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔[ل۱] میرے والد وکیل تھے، میں ابھی ۹ سال کا ہوا تھا کہ میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ اور ۱۴ سال کا ہوا تھا کہ میری والدہ بھی مجھے داغ مفارقت دے گئیں۔ میں نے ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی، اور اس کے بعد ۱۹۰۷ء میں اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں درجہ ۵ میں داخل کر دیا گیا۔[ل۲] یہیں سے (۱۹۱۳ء میں) میں نے اسکول لیونگ سرٹیفکٹ لیا جو اس زمانہ کا میٹرک سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد مجھے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا جہاں سے میں نے ایف۔ اے کا امتحان

ل۱ یہ بات "نذر ذاکر" کی تقریب میں بھی دہرائی کہ دن اور مہینہ صحیح معلوم نہیں اس لیے فروری کے بجائے مئی میں بھی کوئی حرج نہیں ۲۴/۴/۶۸

ل۲ مکتوب بنام مرتضیٰ حسین بلگرامی بحوالہ خورشید مصطفیٰ رضوی

پاس کیا۔ اور پھر لکھنؤ چلا آیا تا وہاں سے میڈیکل کالج میں داخلہ لے کر ڈاکٹری کی سند حاصل کروں؛ لیکن وہاں میں بیمار پڑ گیا۔

میں صرف جسمانی اعتبار سے ہی بیمار نہیں ہوا تھا، میرا ذہن بھی ہر وقت غم کے بوجھ تلے دبا رہتا تھا۔ میرے دو بھائی اسی زمانے میں ٹی۔ بی میں مبتلا ہو کر مر چکے تھے، اور چونکہ میرا بخار ٹائیفائڈ میں تبدیل ہو چکا تھا، اس لیے میں بھی زندگی سے تقریباً مایوس ہو چکا تھا۔ مجھے جیسے یقین سا ہو گیا تھا کہ میں مر ضرور جاؤں گا۔ لیکن چند دن بعد میرا میعادی بخار اُتر گیا اور میں قائم گنج واپس آ گیا۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے میرا تعلیمی سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ مسلسل ایک سال[لہ] تک قائم گنج میں خاموش زندگی بسر کرتا رہا۔ اور اس کے بعد میں نے حالات کے جمود کو توڑنے کے لیے دوبارہ علی گڑھ میں داخلہ لے لیا۔ یہاں سے (۱۹۱۸ء[لہ] میں) بی اے کی ڈگری لینے کے بعد میں نے ایک ساتھ اقتصادیات کے ایم۔ اے اور قانون میں داخلہ لے لیا۔ لیکن اچانک تحریک ترکِ موالات شروع ہو گئی، اور ایک مرتبہ پھر میرا سلسلۂ تعلیم منقطع ہو گیا؛ کیونکہ گاندھی جی اور مولانا محمد علی کی اپیل پر میں بھی علی گڑھ یونیورسٹی کے سیکڑوں طالبعلموں کے ساتھ نکل آیا تھا اور جامعہ ملیہ کی تحریک میں شامل ہو گیا تھا، بس، یہیں سے میری زندگی ایک نئے راستے پر گامزن ہو گئی۔

میری شادی میرے بھائی نے ۱۹۱۵ء میں کر دی تھی۔

(بیوی شاہجہاں بیگم۔ بیٹیاں: سعیدہ بیگم، صفیہ بیگم (اور رقیہ ریحانہ جو ۵ سال کی عمر میں چل بسیں) اول الذکر کے شوہر خورشید عالم خاں قائم گنجی، اور صفیہ بیگم کے شوہر ظل الرحمٰن خاں شاہجہاں پوری۔)

اپنی عمر میں سب سے زیادہ جس شخصیت سے متاثر ہوا وہ اسلامیہ اسکول اٹاوہ کے ہیڈ ماسٹر تھے، ان کا نام مولوی سید الطاف حسین تھا ایسا انسان مجھے آج تک نہیں ملا۔ ان سے زیادہ لائق فائق آدمی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ ان کی محبت، ان کی شفقت اور ان کا علم مجھے آج بھی یاد آتا رہتا ہے۔ میں سوچتا ہوں ایسے انسان اب کیوں نہیں پیدا ہوتے؛ یہ دنیا ایسے انسانوں سے اب خالی کیوں ہوتی جا رہی ہے!

لہ اصل عبارت میں غلطی سے چھ سال لکھا گیا ہے۔ تصحیح کے لئے ملاحظہ ہو: مکتوبِ ذاکر حسین در رضوی لہ ایضاً

میرا کوئی دوست نہیں ہے۔ میں دوست اسے سمجھتا ہوں جو مجھ سے گپ مارنے کے لیے آئے، کسی غرض کے تحت نہ آئے۔ مجھے یہ احساس کر کے بعض اوقات بڑا دکھ ہوتا ہے کہ میرے دوست میرے پاس آتے بھی ہیں تو کسی نہ کسی کام سے ہی آتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آدمی مجھ سے ملنے آیا؛ اس نے اپنا مقصد بیان نہیں کیا، لیکن مجھے اس پر کوئی حیرانی نہیں ہوئی، کیونکہ مجھے یقین ہوتا ہے کہ جب وہ دوسری مرتبہ ملنے آئے گا تب اپنا مقصد بیان کرے گا؛ اور ہوتا بھی یہی ہے، دوسری مرتبہ میرا دوست اپنی غرض بیان کر دیتا ہے!

نائب صدر بننے کے بعد میں اپنی زندگی میں ایک گھٹن سی محسوس کرنے لگا ہوں میں جانتا ہوں، آنے جانے، ملنے جلنے پر پابندیاں ضروری ہیں، لیکن جیسے ان پابندیوں نے میری فطری آزادی ختم کر دی ہے۔ کہیں اکیلے جا نہیں سکتا۔ کچھ خرید نہیں سکتا!!

(اور آخری بار ۶ مئی ۱۹۶۸ء کو مالک رام صاحب کی مرتبہ "نذر ذاکر" کی پیش کش کی تقریب پر اپنے بارے میں دیر تک تفصیل سے بتاتے رہے:-)

آج آپ نے مجھے احساس دلایا کہ ۷۱ سال عمر کے گزر گئے، کیسے گزرے، اچھے گزرے یا برے، اس کا مطالعہ مشکل ہوگا۔۔۔ میرے لیے خصوصیت کے ساتھ۔ یہ مشکل اس لیے ہے کہ میں نے کبھی اپنی زندگی "کام" کو اس طرح پیش نہیں کیا کہ وہ اچھا ہے یا برا! میں نے اپنے آپ کو یا اپنے کام کو کبھی اہمیت نہیں دی۔

دوسرے یہ کہ لشتم پشتم جب ایک منزل پر پہنچا تو دوسری منزل کو بھول گیا؛ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سب کو پروؤں۔۔۔

آج پھر میرا یوم ولادت ہے۔ حال یہ ہے کہ دن تو ہے وہ بھی یقینی نہیں، بہرحال دوسرا یوم ولادت بھی مبارک ہونا چاہیے تو یہ تھا کہ اس موقع پر محاسبہ کرتا اپنی زندگی کا، لیکن افسردہ۔۔۔ کرنا نہیں چاہتا یاد کر کے۔۔۔ بہت سے لوگوں کی یاد وابستہ ہے۔ سب سے پہلے اپنی ماں کی یاد آتی ہے جس پر پوری عمارت بنی۔۔۔ پھر اسکول کے زمانے کے استاد سید الطاف حسین صاحب مرحوم جنھوں نے میری زندگی کی وضع بنائی، کسی استاد کی یاد اتنی عزیز نہیں، اسی زمانہ میں ایک صوفی حسن شاہ صاحب ملے، اگر ان کا اثر نہ ہوتا تو آج میری زندگی مختلف ہوتی۔ معاشیات میں پروفیسر۔۔۔ تعلیمات میں ایڈورڈ اشپرنگر۔۔۔ علی گڑھ میں زیادہ اپنے

دوستوں سے سیکھا، اُستادوں سے نہیں، لیکن کس کس کے نام لوں۔ پھر ترکِ موالات کی تحریک میں زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کیا: قومی تعلیم اور درویشانہ زندگی۔ (پھر کم سے کم ۲۰ سال تک جامعہ کی خدمت کا عہد کیا گیا)... میں کچھ زیادہ زندہ رہ گیا، پچاس سال کے بجائے ۷۱ سال!

اکابر جن سے ملنے کا موقع ملا ان میں سرفہرست گاندھی جی، تعلیمات کے میرے سب سے بڑے مولوی تھے۔ ان کے سپرد کردہ بوجھ کو اُٹھا کر ایسا محسوس ہوا کہ میرا اخلاقی قد ایک دو انچ بڑھ گیا۔ پھر حکیم اجمل خاں صاحب تھے، پنڈت جواہر لال نہرو تھے؛ یہ نام میں جھجک جھجک کر اور شرما شرما کر بیان کر رہا ہوں کہ ان کے اثر سے مجھے اِن سے بہتر بننا چاہئے تھا۔ کوئی معلّم اعلیٰ کے بیج سے آم کا پیڑ نہیں اُگا سکے گا! میرے زمانے میں ایسے اشخاص ملے، جن سے مجھے سہارے ملے۔ اس زمانے کا جو حال ہے آپ دیکھ رہے ہیں، مجھے بھی دکھ ہوتا ہے۔ اگر کوئی سماج بے ایمانی کو اپنا شعار بنالے تو ایمانداریاں کہاں؟ کھوٹی وفاداریاں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، جو ساری اقدار کو نگلے جارہی ہیں۔ کوئی پوچھے اگر ایسا ہے تو کیا اس کو دیکھ مایوس ہو تم؟ میری عقل کہتی ہے کہ ہاں! میرا دل کہتا ہے نہیں!

دلم بجوئے تو با صد ہزار نومیدی
بایں خوش است کہ امیدوار میگذرد

شخصیت

میں کہوں گا تو آپ ماننے کیوں لگے، اس لیے رسل کہتا ہے کہ "انسان میں غیر معمولی توانائی آجاتی ہے جب اُسے اپنی بڑائی یا ذمہ داری یا امتیازی نوعیت کا، دوسروں سے نمایاں ہونے کا، احساس ہو جاتا ہے؛ اور یہ کہ پھر آمادۂ عمل رکھنے کے لیے صرف ایک جذبہ کافی ہوتا ہے، اقتدارِ اعلیٰ کا عشق۔" میرا بھی عرصے سے یہی خیال ہے کہ اس دنیا میں ہر کوئی، افراد ہوں یا اقوام، دوسروں پر چھانے، فتح کر لینے، اپنے کو منوا لینے کے مجنونانہ جذبہ کی زد میں ہے یعنی طاقت کا حصول اور برتری کی تلاش؛ اور یہ سب کچھ اپنی خودی کی تکمیل اور اپنی شخصیت کی تعمیر کے لیے۔ بس ہوتا یہ ہے کہ اُسی کے بقدر وہ فرد یا وہ قوم شریف اور شائستہ کہلاتی ہے، جس قدر وہ اس جذبہ کو حمکار سکے، شائستگی، نرمی، سلیقہ اور تہذیب سکھا سکے۔

ذاکر صاحب نے ابھی پچھلے سال ایک مقالہ ("مہاتما گاندھی: سو سال") میں لکھا تھا۔ "اوروں کو انسانوں کی طرح اپنے کو خود وہ بنانا چاہیے، جو بننا چاہتے ہیں۔" ذاکر صاحب نے اس اعزاز کو جو انھیں ۱۹۶۷ء میں ملا، ۱۹۱۷ء کے آس پاس تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب وہ علی گڑھ کالج کے ممتاز ترین طالب علم شمار کیے جانے... لگے تھے! اور پھر وہاں کے طلبا کی حکومت کے سربراہ چن لیے گئے تھے۔

غلامی کا زمانہ تھا، اپنی حکومت کا تصور دور دور نہیں تھا؛ کبھی کبھی سناٹے کو توڑتی ہوئی کسی حسرت موہانی جیسے دلدادے کی تنہا آواز آجاتی تھی "ہم سوراج چاہتے ہیں!" مگر وہ بھی ماحول میں دم توڑ دیتی تھی۔ علی گڑھ میں جہاں کی فضا متضاد عناصر سموئے رکھنے اور سموئے رکھنے میں اپنا مثیل نہیں رکھتی، انگریز پرستی کے ساتھ باغی خون بھی پرورش پا رہا تھا؛ حسرت بھی اسی سے نکلا تھا، محمد علی بھی، ذاکر حسین بھی؛ کالج کے ایک طالب علم

نے، یہ ۱۹۱۷ء ہی کے آس پاس کی بات ہے، افلاطون کی کتاب، جمہوریہ/ ریاست کا ترجمہ شروع کر دیا تھا! خاص اسی کتاب سے دلچسپی کے آخر کیا معنی ہیں، جس کے مصنف نے اپنی خوابوں کی جمہوریہ کے صدر ریاست ہونے کا اعزاز کسی ماہر تعلیم قسم کے اسکالر کے لیے رکھ چھوڑا تھا؟ اسلامی ہندستان کی تاریخ میں یہ کیسے عجیب متوازی سلسلے ہیں، اور کیسی اعتماد انگیز کڑیاں کہ سید احمد شہیدؒ جنھوں نے انیسویں صدی میں اپنے دور میں مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پہ جمع کرنے کی مبارک کوششیں کی تھیں، ان پر کتاب لکھنے والا ابوالحسن ندوی بیسویں صدی میں اپنی ساری کوششیں اس پر صرف کیے ہوئے ہے کہ اس وقت ہندستانی مسلمان کسی طرح ایک شیرازے میں پرو جائیں؛ ۱۹۶۴ء کی کنونشن کی کوشش اس سلسلہ کی کتنی جاندار کڑی تھی —— اور ۱۹۱۷ء سے ۱۹۳۲ء تک افلاطون کی جمہوریہ سے مسلسل دلچسپی قائم رکھنے والا مصنف، ذاکر حسینؒ، ۱۹۶۷ء میں دنیا کی سب سے بڑی جمہوریہ کا صدر ہو جائے! زندگی کو آپ کتنا ہی حقیقتوں سے تعبیر کریں، لیکن کتنی ہی جگہ جب ایسے اسرار (MYSTERIES) سے دو چار ہوتا ہوں تو ٹھٹک کے سوچنے لگتا ہوں، آخر یہ سب چکر ہے کیا۔ اتفاق؟ محض اتفاق؟ صرف اتفاق!

مسئلہ نہ جواہر لال (بعد میں اندرا گاندھی) کی پشت پناہی کا تھا، نہ آزاد ہندستان میں اہل اشخاص کی کمی کا، نہ تبلیغی فرقہ کو خوش کر کے سیکولر نمائش کا؛ مسئلہ صرف شخصیت کا تھا؛ کوئی نہ کوئی شخصیت ہوتی ہے، کوئی نہ کوئی پیاس ہوتی ہے، جو اپنے کو شروع سے اس طرح DEVELOP کرتی چلتی ہے کہ پانی اس کی طرف کھنچا چلا آتا ہے، تعمیر شخصیت کے اسباب بھی مہیا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اخلاق بھی۔ اعلیٰ اقدار کی سیوا، سیرت کی تعمیر، کردار کی تہذیب، یہ سب ذرائع رہے اصل چیز شخصیت کی تخلیق، تزئین، اور تقویت کے لیے! مسئلہ صرف اتنا ہی تھا، جس نے پوری دنیا کو پورے گرد و پیش کو مجبور کر دیا تھا کہ اس شخصیت کو اس طرح بنائے! بالآخر شخص اہم ہے نہ کہ گرد و پیش!!

یہ قربانیاں دینے کی جو باتیں بیان کی جاتی ہیں، میں انھیں بالکل نہیں مانتا۔ کوئی قربانی ورُبانی نہیں دیا کرتا۔ قربانی صرف ایک ہوتی ہے، جب کوئی اپنی شخصیت کو قربان کر دیتا ہے؛ یہ درجہ ایک موقع پر اسفل ترین ہوتا ہے، ایک موقع پر اعلیٰ ترین؛ اور قربانی کا دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے۔ اپنی شخصیت کی تعمیر کے لیے، اپنی عظمت کی تلاش میں، اپنی خودی کی نگہبانی کی راہ پر گامزن، اپنے آپ کو دوسروں کی اور سب سے بڑھ کر خود

اپنی نظروں میں محبوب و محترم بنائے جانے میں کتنے ہی سخت مقامات سے گزرنا پڑتا ہے جو دوسروں کی نظر میں کڑی آزمائش کے مقامات ہوتے ہیں، جب کہ ان کے اندر پڑنے والے کو کچھ بھی پتہ نہیں چلتا۔

اپنے ذوق کا مشغلہ (یا مشن!) مل جائے اور پھر اپنے شوق کے مطابق اُسے چلانے کی من مانی آزادی ہو، خود پورے جہاز کا CAPTAIN ہو، اور CAPTAIN SHIP کا احساس بھی ہو تو پھر ساری عمر نہ بازو شل ہوتے ہیں، نہ ہمت جواب دے سکتی ہے، وہ تو وقت گزرنے کے ساتھ اور جوان ہوتی جاتی ہے۔ جامعہ ملیہ اور ذاکر صاحب کا کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔

علی گڑھ سے جو باغی طلبا کا گروہ نکلا، ذاکر صاحب اس کے سردار تھے۔ جامعہ میں آنے کے کچھ ہی دن بعد کہ ابھی جامعہ علی گڑھ ہی میں تھی، ذاکر صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے جرمنی روانہ ہو گئے۔ ڈاکٹریٹ کا اعزاز لے کر ۱۹۲۶ء میں جامعہ میں واپس آئے اور تین سو روپیہ ماہانہ پر پرنسپل ہو گئے۔ اس زمانہ کے تین سو آج کل کے تین ہزار سے کیا کم ہوں گے! پھر ایک ایسے ادارہ کے جو اس تحریک کے زیر اثر وجود میں آیا تھا (اور اس کی ممتاز علامت بن گیا تھا) جو دنیا کے سب سے بڑے سامراج سے ٹکر لے رہی تھی! پھر یہ بھی تھا کہ اس زمانے کے اسلامی ہند کی سب سے عظیم شخصیت حکیم اجمل خاں (اور اسی طرح ان کے بعد درجہ رکھنے والے مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری) جہاں کہیں جامعہ کا مشن لے کر جاتے، ذاکر صاحب کو ساتھ لے جاتے اور اپنی تقریروں میں ذاکر صاحب کا خاص طور پر ذکر" کرتے کہ وہ برلن سے تعلیم پا کر آئے ہیں، لیکن بڑی ملازمت تلاش کرنے کے بجائے ایثار و خدمت کے جذبہ میں جامعہ ملیہ سے منسلک ہو گئے ہیں"۔ تقریر ختم ہوتی تو پنڈال پر ذاکر صاحب کو لا کر کھڑا کر دیا جاتا۔ وہ کوئی تقریر نہیں کرتے، ایک آدھ منٹ کھڑے رہ کر اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے۔ ایسے ہی ایک جلسہ کا تذکرہ صباح الدین عبدالرحمن نے بالکل اسی طرح کیا ہے۔[1]

---

[1] معارف، جون ۶۹ء

سال بھر سے کچھ اوپر ہوا ہوگا کہ حکیم صاحب، جامعہ کے روحِ رواں، کا انتقال ہوگیا۔ ذاکر صاحب نے اپنی تنخواہ خود گھٹا کر ۷۰۰ روپے کرلی۔ اب وہ واقعتہً جامعہ کے سردارِ اعلیٰ ہوگئے تھے کہ اس کام میں حکیم صاحب کی سی دلچسپی لینے والا اب کوئی نہ تھا۔ پھر جلد ہی امداد باہمی کے انداز پر انجمن تعلیم ملّی بنا کے جامعہ کو اس کی سرپرستی میں دے لیا اور طے کرلیا کہ انجمن کا کوئی رکن ۱۵۰/- روپے ماہانہ سے زیادہ نہ لے گا اور یہ بھی کہ کم سے کم بیس سال تک جامعہ سے ہر حالت میں وابستہ رہنا ہے۔ جامعہ پر اچھے زمانے کم ہی گزرے۔ اس لیے یہ تنخواہ بڑھتی تو خیر کیا، کم ضرور ہوتی چلی گئی، تا آنکہ جب وہ اُسے چھوڑ کے نومبر ۴۸ ۱۹ء میں علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوئے تو ۸۰ روپے مل رہے تھے۔

اس مفلسی میں بھی مزہ تھا۔ جامعہ میں اپنے آپ کو رہنے کے لیے ذاکر صاحب نے اس لیے آمادہ کرلیا تھا کہ یہاں کی شخصیت کے اظہار کا وسیلہ بن گئی تھی، تنہا وسیلہ۔ اجمل خاں کے انتقال کے بعد ذاکر صاحب ہی کی تحریک پر پورا دروبست ان کے اور ان کے ہم کار رفیقوں کے ہاتھوں میں سونپ دیا گیا تھا؛ اس سے مزید اپنائیت پیدا ہوتی چلی گئی، اور وہ خالصتہً ذاتی تخلیق کا درجہ اختیار کرتی گئی۔ اور اگرچہ جامعہ خود کوئی عظیم ادارہ نہ بن سکی، (شاید اس لیے کہ وہ وسیلہ تھی نہ کہ مقصد!) لیکن جامعہ تحریک نے ایک عظیم شخصیت کی تعمیر ضرور کردی۔ اسی لیے جب تاریخ اس عہد کو تولے گی تو جامعہ کو تو شاید کوئی درجہ نہ ملے، لیکن جامعہ تحریک کو نظر انداز کرنا اس کے لیے مشکل ہو جائے گا۔

بڑی شخصیت کے لیے، ادارہ، اسکیم، اور افراد جو بھی اس کے راستے میں آتے چلے جاتے ہیں، شخصیت کے اظہار کا وسیلہ بنتے چلے جاتے ہیں۔ جامعہ تحریک کی طرح وردھا اسکیم کی بھی یہی صورت حال ہے جو خود کچھ بھی نہ ہوتے اسکیم کے صدر نشین کی شخصیت کو چمکاتی چلی گئی۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میرا مضمون اقتصادیات رہا ہے جس سے حالات نے مجھے دور ہی رکھا،

——— اور میں اس غیر متعین وجود میں تبدیل ہو گیا ہوں جسے ماہر تعلیم کہا جاتا ہے۔"[1] علمی تربیت معاشیات میں ہوئی، مگر پیشہ تعلیمات کا اپنایا، نورانی لکھتے لکھتے یہاں کچھ ٹھٹک جاتے ہیں، حالانکہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ واقعتاً یہی ایک چیز ہے جسے ہم متعین طور سے CATEGORISE نہیں کر سکتے۔ اور اس طرح متعلق شخص کو کائنات کی ساری وسعتوں میں آزادی سے گھومنے پھرنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ کوئی موضوع اس کے لیے اجنبی نہیں ہوتا، کوئی دربند نہیں ہوتا، لیکن وہ کسی موضوع پر حاکمانہ دسترس نہیں رکھتا جب تک کہ آپ اس کے حدود کو غیر متعین نہ کر دیں۔ اور غیر متعین کرنے کے بعد؛ پھر کوئی حریف نہیں ٹھہرتا! اس شخصیت کے آزاد ارتقا میں جو مدد مل سکتی ہے اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

علی گڑھ کو ذاکر صاحب کے مزاج اور افتادِ طبع کی تشکیل میں بنیادی درجہ حاصل ہے۔ لیکن کئی چیزیں ایسی تھیں جو، مجھے لگتا ہے، سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات' نے انھیں شعوری طور سے اکتساباً، اپنانے پر آمادہ کیا۔ ان کی تحریروں میں بعض جملے ایسے ملتے ہیں جن سے کچھ ترشح ہوتا ہے؛ ۔ "میں بہت خاکسار واقع ہوا ہوں" یہ انھوں نے ۱۹۲۸ میں لکھا تھا۔ محض اس جملہ کا لکھنا ہی میرے نزدیک اہمیت رکھتا ہے۔

ایک مضمون میں لکھتے ہیں :

"بند و بست دوامی جس پر شکن ہے کارنوالس کو یقین ہو، وہ محض دھوکا ہے جو آدمی خود اپنے نفس کو دے لیتا ہے تاکہ اپنے مقصد کے حصول میں اپنی اخلاقی قوت کو بڑھا سکے۔"

بعضوں کا کہنا ہے کہ عہدِ فقر سے دورِ فخر تک پہنچنے کی کڑی منزل وہ اسی جملے کے بین السطور کے سہارے جھیل گئے!

مارکس پر ——— ایک تحریر میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"خود مارکس کی زندگی میں یہ حقیقت خارجی تمام تر جماعتی زندگی سے عبارت تھی، یعنی یہ اُن مصنوعی لوگوں میں تھا جن کے نزدیک جماعتی زندگی کی قدر اعلیٰ ہے۔"

---

[1] خطبہ: انڈین پولیٹیکل سائنس ایسوسی ایشن: جرنل، اکتوبر ۱۹۶۲ء

واقعہ یہ ہے کہ مصنوعی کا لفظ یہاں بہت اہم ہے۔ ذاکر صاحب بھی ساری زندگی مارکس کی طرح یہی کہتے رہے کہ "اصلی چیز اور ابتدائی چیز سماج ہے! اور اکیلا آدمی 'فرد' اس کے سہارے اور اسی کے لیے ہوتا ہے" لیکن نورانی کے بقول ۱۹۵۹ء تک وہ 'فرد' کی اہمیت کے بھی قائل ہو چکے تھے ــــ اور میرے نزدیک ان کی خیم جنم کی سیاسی روح صرف 'فرد' کی قائل تھی باقی جو کچھ تھا محض اکتساب!

"تعلیمی خطبات" میں ایک جگہ لکھا ہے:

"پیسٹالوزی کیا اچھا جواب دیتا ہے، جس میں ایک اچھے معلّم کی روح جھلکتی ہے:

جی ہاں بچہ ہی ہوں، اور مرتے دم تک بچہ رہنا چاہتا ہوں ــ تمھیں کیا بتاؤں دل کو اس میں کیسی راحت ملتی ہے کہ آدمی ذرا ذرا بچہ بھی ہو، یقین کر سکے، بھروسہ کر سکے، محبت کر سکے، غلطی ہو جائے، بھول چوک ہو، حماقت ہو تو ان سے لوٹ آئے، اور آپ کے سارے عقلمند لفنگوں سے زیادہ بھولا، زیادہ اچھا، اور آخر میں چل کر زیادہ عقلمند بھی نکلے۔ جناب عالی اس کے خلاف بہت کچھ دیکھا اور بہت کچھ سنا، مگر پھر بھی اس میں بڑا مزا ہے کہ آدمی آدمیوں کے متعلق اچھے سے اچھا گمان رکھے، اور چاہے روز فریب کھائے! روز نئے سرے سے آدمیوں کی نیک دلی پر یقین کرے، اور عقلمندوں اور بے وقوفوں کو، کہ دونوں گمراہ ہوتے ہیں، معاف کرے۔"

اس بچپن کو، معاف کرنے کی اس صلاحیت کو، اور روز نئے سرے سے فریب کھانے کی قوتِ برداشت کو جس طرح ذاکر صاحب نے اپنی سرشت کا نہ بھلایا جانے والا حصہ بنا لیا تھا، اس سے ہر وہ شخص واقف ہے جو ان سے ذرا بھی قریب رہا ہے۔

یہ سارے اکتسابات، یہ شعوری طور سے سعیِ پیہم سے بعض ضروری قسم کی خصوصیات کو اپنے مزاج اور کردار کا جزو بنانا، یہ سب کچھ، ایک برتر شخصیت کی شعوری کوششیں تھیں، اپنے کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے آخری درجے تک اپنی تعمیر کے لیے، تعمیر کی تکمیل کے لیے۔

اسی سلسلہ کا ایک پہلو اور بھی ہے۔

ذاکر صاحب پھولوں کے جتنے بڑے عاشق تھے، اس سے کچھ زیادہ پتھروں کے شوقین تھے۔ یہ پھول اور پتھر کا ملن، متضاد چیزوں کی یک جائی بڑے عجیب و غریب انداز پہ ذاکر صاحب کے یہاں اور کئی باتوں میں بھی ملتی ہے؛ "ظاہری لاابالی پن، مگر طبیعت کی گہرائی میں بہت کچھ[۱]، توکل، مگر اس توکل کی تہ میں ایک بے چینی[۲]، سیاست سے بے حد برگشتہ، لیکن اٹاوہ کے ہائی اسکول عہد سے[۳] سیاست میں جو دل چسپی شروع ہوئی تو تحریک عدم تعاون سے ہوتی ہوئی ایوانِ صدارت پر جا کے رُکی۔ حقیقت میں اقبال اور رومی کے پروردہ، لیکن جب بھی اثر پذیری کا ذکر ہوتا تو گاندھی جی کا نام لیتے۔ فقیری کا زمانہ تھا تو ایسا شاہانہ مزاج تھا کہ ذرا سا رُخ بدلا دیکھتے تو ہزاروں لاکھوں کا چندہ دینے والے کی بھی پروا نہ کرتے، اور شاہنشاہی کا زمانہ آیا تو ایسے فقیرانہ کہ ملنے والے محجوب ہو جاتے۔ کردار میں جرأت اور خلوص کا یہ عالم[۴] کہ جس کی قسم کھائی جا سکے، لیکن ساتھ ہی "مردم شناسی، موقع شناسی، مصلحت بینی" اور "اپنے کو گرد و پیش کے ماحول میں ڈھال لینے کی خصوصیت[۵]" بھی اس درجہ کہ قریبی دوست تک محسوس کر لیں۔

یہ ان کی شخصیت کے تضادات نہیں، وہی اصلی اور اکتسابی کی مسلسل آویزش ہے جو بس نت نئے روپ میں جلوہ گر ہے۔

ایک سب آگ، ایک سب پانی   دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

یہ آگ اور پانی کی آمیزش تھی جو متوازن، متناسب، متحرک اور متحمل شخصیت،

۱؎ محمد مجیب بحوالہ اعظمی: ۱۱ ۲؎ ایضاً: ۱۴ ۳؎ اٹاوہ اسکول کے ساتھی پروفیسر حبیب الرحمٰن کا بیان (علی گڑھ گزٹ: ذاکر نمبر): "ترکی اور اٹلی کی جنگ ہو رہی تھی۔ ذاکر صاحب کی تحریک پر ہم لوگوں نے گوشت کھانا بند کر دیا تاکہ جو روپیہ بچے وہ ترکوں کی مدد کو بھیجا جائے..."

"انھیں جلد سے جلد خبریں معلوم کرنے کی اتنی فکر اور اس قدر اشتیاق رہتا کہ وہ پانیر روزانہ خریدنے کیلئے اٹاوہ کے اسٹیشن جاتے..." — "اپنی بے پھندنے کی ترکی ٹوپی میں چندہ جمع کرنا شروع کیا، چندہ وصول کرتے وقت فرمایا: لائیے لائیے حضرات، جو تانبے کے پیسے اس ٹوپی میں ڈالیں گے وہ سیسے کی گولیوں میں تبدیل ہو کر دشمن کے سینے میں پار ہو نگے۔" ۴؎ عابد حسین: نقوش، شخصیات نمبر ۵؎ نورانی

ہم آہنگ شخصیت کے لیے ازبس ضروری تھی۔

"میں نے خاصی متحرک زندگی بسر کی ہے، مگر سب کی سب بخیر ارادی!
ترکِ موالات میں علی گڑھ کو چھوڑنا، یہ تھا میری زندگی کا پہلا شعوری
فیصلہ، شاید پوری زندگی کا تنہا اکلوتا فیصلہ؛ میری بقیہ زندگی محض
اسی کا بہاؤ رہی ہے۔"

نورانی ذاکر صاحب کے اس قول کے ناقل ہیں؛ اور ایک جگہ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ علی گڑھ سے لے کر اب تک، ذاکر صاحب خود اپنے بارے میں کبھی سنجیدگی سے باقاعدہ پروگرام بنا کے نہیں چلے۔

شاید یہ سب کچھ بالکل صحیح ہے۔ فرد اور کائنات کے رشتوں میں اس قسم کی شخصیت زیادہ جھمیلوں میں نہیں پڑا کرتی؛ کوئی بھی راہ ہو، وہ اُسے مجبور ہو کر اپنی منزل ہی کی طرف لے جائے گی۔[1] اپنے پر اعتماد ہو تو غیر کو آزمانے، کے چکر میں پڑنے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ اہمیت غیر کی نہیں، صرف اپنے آپ کی ہے؛ أنا ولا غیری!!
اہمیت صرف اس کی ہے کہ اپنے آپ سے خلوص کا دامن کسی جگہ چھوٹ تو نہیں رہا۔

بس اپنا احتساب، اور مسلسل احتساب، کافی ہے۔ لوگ راستوں کی باتیں کرتے ہیں، منزل کی باتیں کرتے ہیں، وسیلوں اور ذریعوں کی بات کرتے ہیں؛ ٹھیک ہے، عام آدمی کے لیے یہ سب کچھ بالکل صحیح ہے۔ لیکن میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میں نے راستوں کو چلتے دیکھا ہے، تھکتے دیکھا ہے، بے چینی سے مچلتے ہوئے بھی دیکھا ہے؛ کرب کے عالم میں انتظار کرتے ہوئے بھی پایا ہے[2] اور صحیح راہ رو آ جائے تو پاؤں سے لپٹتے ہوئے بھی دیکھا ہے!

---

[1] کیا غضب کا شعر کہا ہے جذبی نے:

دل اگر دل ہے تو جس راہ پہ لے جائیگا — دردمندوں کی وہی راہ گزر بھی ہوگی

[2] ہر راہ رو کو تکتے ہیں کن حسرتوں کے ساتھ
کتنے اُداس ہیں مری منزل کے راستے

تین قسم کی شخصیتیں ہوتی ہیں :

(ایک) وہ جو اپنی ساری شخصیت کو اس کام میں لے آتی ہیں کہ ایک نئی شخصیت کو جنم دے کر، اپنے عناصر کو اس میں سمو کر، اور اس طرح گویا اپنی شخصیت کو ایک نئی شکل میں تسلسل دے کر، خوش خوش اور چپ چپاتے اُس راہ پر چلی جاتی ہیں جہاں سے پھر لوٹ کے نہیں آتیں۔

دوسرے وہ جو اپنی شخصیت کی تکمیل اپنے آپ ہی میں کرنے کے درپے ہیں، مگر زندگی اور زمانہ انھیں اتنی مہلت نہیں دیتے۔ وہ بھی بالآخر ایک انجانے راستے یا ابدیت کی تلاش میں روانہ ہو جاتی ہیں، لیکن اپنی ادھوری شخصیت کی تکمیل کے لیے انھیں نیا جنم لینا پڑتا ہے، کئی ایک کو تو کتنی ہی بار!

اور تیسری وہ خوش بخت جو اپنی شخصیت کی تکمیل اپنی زندگی ہی میں کر لیتی ہیں۔

دو سال سے میرا خیال تھا، ذاکر صاحب اس تیسری قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنھوں نے بڑی سہولت اور نفاست سے اپنی اسی زندگی میں اپنی شخصیت کی تکمیل کر لی ہے۔ اسی لیے جب مجھے ان کے انتقال کی خبر پہنچی تو ذرا سی بھی حیرت نہیں ہوئی، کہ میری نظر میں یہ نہ غیر متوقع تھی نہ قبل از وقت۔ میں جو پچھلے پندرہ سولہ سال سے ان کی زندگی کی جزئی تفصیلات کا متعاقب مطالعہ کر رہا تھا، یہ جانتا تھا کہ ذاکر صاحب اپنے دو پیشروؤں کی مانند پانچ سال صدارت کر کے گمنامی کے غار میں سونے کے لیے نہیں پیدا ہوئے۔ یہ ستارہ صرف بلندی کی جانب چڑھتا جاتا ہے شخصیت کی تکمیل کی اب کونسی منزل رہ گئی تھی؛ سوائے اس کے کہ (۳ مئی ۶۹ء کو) وہ ایوانِ صدارت میں بغیر کسی قسم کی طول طویل بیماری کے اپنی روایتی سہولت کے ساتھ جان جاں آفریں کے سپرد کر دیں!

اتنا کچھ لکھ چکا تھا، اور اپنے نتائج پر پہنچ چکا تھا کہ عابد صاحب نے ذاکر صاحب کا تجزیہ کرتے ہوئے بڑے لطیف انداز میں ان کی شخصیت کے ایک جھول کی طرف جو اشارہ کیا ہے اس پر نظر پڑی۔ اور ذہن میں کسی قدر کنفیوژن پیدا ہو گیا۔

عابد صاحب نے لکھا ہے:-

"انسان دوست شخصیت دو قسم کی ہوتی ہے؛ ایک مرشد و معلم کی، دوسری مصلح و مجاہد کی۔ مرشد و معلم کی توجہ کا موضوع انسان بحیثیت فرد کے ہے، وہ ارشاد و ہدایت، تعلیم و تربیت کے ذریعہ افراد کے اندر ان قدروں کو پیدا کرتا ہے جو انسانیت کے بلند منصب کے سزاوار بنائیں۔ مصلح و مجاہد کا کام انسانی جماعت یا سماج کا سدھار کرنا ہے۔ یعنی ان خرابیوں سے جو سماج میں پیدا ہو گئی ہیں لڑنا اور ان کو دور کرنا، تاکہ انسانیت کی دبی ہوئی، روندی ہوئی قدریں ابھر آئیں، چمک اٹھیں۔ دونوں قسم کے انسان دوستوں کی زندگی کا قانون محبت ہے، لیکن ایک کے ہاں محبت جمالی شان دکھاتی ہے۔ دوسرے کے ہاں جلالی؛ کبھی کبھی یہ دونوں شانیں ایک ہی شخصیت میں جمع ہو جاتی ہیں اور وہ پیمبر یا مجدد کی شخصیت بن جاتی ہے۔ ذاکر صاحب کی انسان دوستی اب تک مرشد و معلم کی شان رکھتی ہے۔ وہ انسان کو فرد کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، اس کی روح سے محبت رکھتے ہیں اور اسے تعلیم و ہدایت کے ذریعہ سنوارنا چاہتے ہیں۔ وہ کہا کرتے ہیں اچھے مسلمان پیدا کرو، اچھی اسلامی جماعت پیدا ہو جائے گی۔ اچھے ہندستانی بناؤ، اچھا ہندستان بن جائے گا۔ لیکن وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ معلم کا مدرسہ ہو یا مرشد کی خانقاہ، دونوں کا اثر فرد کی تعلیم و ہدایت میں محدود ہے؛ دوسرے اجتماعی ادارے، خاندان، طبقہ، قوم، مذہب، رسم و رواج الگ الگ نہیں تو مل کر انسانی شخصیت کی تشکیل میں کہیں زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر ان اجتماعی سانچوں میں سے اکثر خراب ہو گئے ہیں، اگر آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہو تو معلم اور مرشد کی ساری سعی رائیگاں جاتی ہے جب تک کوئی مصلح اور مجاہد اجتماعی سانچوں کو نہ سدھارے یا ان کو توڑ کر نئے سانچے نہ بنائے۔[۱۵]

یہ تحریر اس وقت لکھی گئی تھی جب ذاکر صاحب علی گڑھ میں وائس چانسلری کا آخری زمانہ گزار رہے تھے، اسے پڑھ کے میں یہ سوچنے لگ گیا کہ زندگی کے آخری دور میں معلم و مرشد کی یکایک تبدیلی اور بالکل نئے انداز کی ذمہ داریوں کا بوجھ بھار اٹھا لینے پر آمادگی کہیں عابد صاحب کے پیش کیے ہوئے اسی چیلنج کو قبول کر لینے کے

---

[۱۵] عابد حسین، مجموعۂ عظمی : ۴۴ : ۴۷ - اصلاً یہ جنوری ۵۵ء میں نقوش میں شائع ہوا تھا۔

شاخسانے تو نہیں تھے؟ اور اگر ایسا تھا تو ـــــ جب دُھندلکے چھٹے ہوں گے اور خواب ٹوٹے ہوں گے؛ جب انھیں احساس ہوا ہوگا کہ جس جگہ وہ پہنچے ہیں اُسے اُنھوں نے مصلح اور مجاہد کا منصب سمجھنے میں غلطی کی تھی؛ جب ان کے عزیز ترین دوست کے قلم سے ان کے لیے ایسے جملے نکلنے لگے ہوں:

"علی گڑھ کی طالب علمی سے مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری تک ہر معرکہ کا سامنا کرنے میں ذاکر صاحب نے INITIATIVE (جرأتمندانہ اقدام) ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رکھا اور اس اعتماد اور حسنِ تدبر کے ساتھ رکھا جو ذاکر صاحب ہی کا حصہ تھا؛ جس سے وہ اپنے ہی نہیں، ہر قبیلے کی آنکھ کا تارا بنے رہے۔ اس کے بعد موصوف بہار کے گورنر، جمہوریہ ہند کے نائب صدر ہوئے، اور اب صدر ہیں۔ ابتدائی سفر کی سمت و رفتار، غایت و نہایت، سفر کے ساتھی، بادہ پیمائی کے حوصلے اور آبلہ پائی کے مزے سب بدل گئے۔ نہ وہ حضر ہے برگ و ساماں، نہ وہ سفر بے سنگ و میل! پہلے کا INITIATIVE معدوم نہیں تو معطل ہے۔

غالب کہتے ہیں:

وہ دادو دید گرانمایہ شرط ہے ہمدم!
وگرنہ مہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے"

جس کی تاب سہروز ہوتی ہو؛ اور پھر ہر وقت انھیں بھی اس کا احساس رہنے لگا ہو، تو کیا عجب کہ اگر انھوں نے معلم و مرشد سے آگے بڑھ کے مصلح و مجاہد کا منصب قبول کر لینے پر اپنے آپ کو راضی کر لیا ہو تو تکمیلِ شخصیت میں جانے جاتے ایک رخنہ پڑ گیا ہو؛ ایک کمی رہ گئی ہو جسے پورا کرنے کے لیے اس عظیم شخصیت کو از سرِ نو پھر اپنی تلاش، تعمیر اور تکمیل کے سفر پر روانہ ہونا پڑے!

---

۱۵ مجیب صاحب نے ذاکر صاحب کی افتادِ طبع کے اس خاص عنصر یعنی ضد میں چیلنج قبول کرنے اور اُن سے عہدہ برآ ہونے کا ذکر کرتے ہوئے اس کی کئی مثالیں دی ہیں:
السٹریٹیڈ ویکلی، ذاکر نمبر جولائی ۶۹ء

۱۶ رشید احمد صدیقی: مقدمہ کتاب خورشید مصطفی رضوی، ۲۷ مئی ۶۸ء

افکار

ذاکر صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے:۔

"ذہنی زندگی تو کسی ذہنی زندگی ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ چراغ ہمیشہ کسی دوسرے چراغ ہی سے جلایا جا سکتا ہے۔ ذہنی زندگی میں لَو نہ ہو تو میں کا وجود بھی نہ ہو۔"

ذاکر صاحب کوئی بہت بڑے مفکر یا فلسفی قسم کے لوگوں میں نہیں تھے لیکن ان کے کچھ مرکزی خیالات ضرور تھے، اور ان میں سے ایک شخصیت کی تعمیر کا انھوں نے غالباً اپنی طالب علمی ہی کے زمانہ سے اپنا منشا اور نصب العین بنا لیا تھا، جو ان کا مشن بھی بنا رہا اور مرکزی خیال بھی۔

ذاکر صاحب کے بنیادی افکار کا جہاں تک تعلق ہے، اقبال ان کے پہلے مرشد تھے۔ اور اس میں کسی کو شرمانے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ پوری چھپن ۱۹۶۵ء تک ان کے ساتھ ساتھ رہے۔ جب شملہ کے ادارہ تحقیق کے منتخب فضلاء کے سامنے اپنا خطبہ دیا تو تان اقبال ہی کے "مردِ خدا" پر ٹوٹی۔ اقبال کے تصور خودی کو جس طرح انھوں نے ہضم کیا، اور پھر اُسے نکھار کے شخصیت کی تعمیر کا روپ دیا اُسے دیکھ کے اقبال کو بھی خوشی ہوتی ہوگی کہ اس نے اپنے فوراً بعد آنے والی نسل میں کم سے کم ایک مرد خود آگاہ تو پیدا کر ہی دیا۔ ذاکر صاحب گاندھی جی کے چیلے تھے، میں اسے نہیں مانتا۔ اقبال یا گاندھی جی ان دونوں میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کیا جا سکتا تھا، اور اقبال کی اتنی گہری چھاپ پڑ چکی تھی کہ گاندھیائی افکار سے متاثر ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ گاندھی جی کے کام سے، ان کی درویشانہ زندگی سے، قومی تحریک میں ان کی لگن سے متاثر ہونا دوسری بات ہے۔ لگن کی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک زمانہ میں مولانا محمد علی

سے بھی اچھے خاصے متاثر رہے، مولانا ابوالکلام سے بھی کچھ نہ کچھ سیکھتے رہے۔ مولانا کے الہلال اور البلاغ کی طوفانی فلک شگاف خطابت نے ۱۹۱۲ - ۱۶ء کے مسلم نوجوانوں کے دماغوں کو ہلا کے رکھ دیا تھا[۱]۔ (خود مولانا تو الہلال کا دور گزار گئے لیکن ذاکر صاحب کو پھر کبھی حلق سے بولنا نصیب نہیں ہوا، جب بھی بولے دل کی گہرائیوں سے اور جب بھی کچھ لکھا، ہمیشہ دل کے خون سے) اور الہلال والے مولانا نے انگلی پکڑ کے اپنے پرستار کو اقبال کے سپرد کر دیا جو بالکل نئی منزل تھی۔

ذاکر صاحب کی تقریروں اور تحریروں میں، اقبال کی نظموں کے ٹکڑے جس طرح نثر کا جامہ پہنے رواں دواں چلے آتے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اقبال کو کتنا اور کس کس طرح پڑھا تھا۔

تفصیل پھر کبھی، لیکن اس وقت یہ دو چار چیزیں تو آپ ملاحظہ کرہی لیں:

جامعہ کی عمارتوں کے سنگ بنیاد کی تقریب کا اعلان کرتے ہوئے جنوری ۲۵ء میں ذاکر صاحب نے لکھا تھا:

"اس مبارک رسم کو انجام دینے کے لیے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا گیا ہے جو نہ فرمانرواں میں ہے، نہ ارکانِ سلطنت میں، نہ صاحبانِ دولت میں، نہ اربابِ علم میں، نہ رہبرانِ ملک میں، نہ اکابرِ قوم میں؛ جو کچھ بھی نہیں ہے، مگر سب کچھ ہو سکتا ہے: یہ اس نژادِ نو کا نمائندہ ہے جس سے علامہ اقبال نے جاوید نامہ میں خطاب کیا ہے۔ یہ جامعہ کا سب سے چھوٹا بچہ ہے۔ اربابِ نظر اس انتخاب کی داد دیں گے، اور یہ تسلیم کریں گے کہ مستقبل کا مالک ہم حال کے غلاموں سے اس منصب کے لیے کہیں زیادہ موزوں ہے[۲]۔"

ایک اور موقعہ پر اقبال کے شعر کو اس طرح نثر کا جامہ پہناتے ہیں:

"درخت میں سر ڈالی اور پتی بھی اپنا الگ وجود رکھتی ہے لیکن ڈالی یا پتی کے ٹوٹ جانے سے درخت ختم نہیں ہوتا؛ درخت سے الگ

---

[۱] گزٹ: ذاکر نمبر؛ مولانا آزاد کے انتقال پر ذاکر صاحب کی تقریر؛ اوزانی کی تفصیل کے مطابق اس زمانہ میں وہ کامریڈ کے مولانا محمد علی اور الہلال کے مولانا آزاد، دونوں سے متاثر تھے۔

[۲] عبداللطیف اعظمی: ۴۳۔

ہو کر ڈالی اور بیچ کے لیے سوائے فنا کے کچھ اور نہیں۔"
مگر خاص کر وہاں جہاں وہ اپنے مرکزی خیال کو پیش کرنے لگتے ہیں!

"میرا پیام آپ کو یہی ہے کہ اپنی سیرت کی تربیت کو اپنے ہاتھ میں لیجئے۔ ضبط نفس اور بے غرض خدمت سے اس کے عناصر کی پرورش کیجئے، اچھی سیرت بنائیے، اور اسے اقدار عالیہ مطلقہ کا خادم بنا کر شخصیت اخلاقی یعنی 'بندۂ مومن' اور 'مرد مجاہد' کے مرتبۂ بلند پر پہنچائیے۔ کام بڑا دشوار ہے، اور عمر بھر کا کام ہے، مگر اسی کے لیے تو زندگی عطا ہوئی ہے۔"[۱]

اور ایسی جگہوں پر تو اقبال سرتاپا ان پر چھا جاتا ہے:

"اپنی صلاحیت اور اپنی انفرادیت کو پا لینا اور اس کے مختلف عناصر میں یک جہتی پیدا کر لینا ہی کیرکٹر ہے۔ جب آدمی اپنے کیرکٹر کو کسی طرح مقصد کے لیے وقف کر دے تو وہ شخصیت بن جاتی ہے۔ اور شخصیت 'اعلیٰ اقدار' کی سیوا میں لگ جاتی ہے تو اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ بن جاتا ہے، اس کی زبان خدا کی زبان بن جاتی ہے۔ کیونکہ اعلیٰ اقدار خدا ہی کا نام ہے۔ شخصیت دنیا میں خدا کا سب سے بڑا شاہکار ہے۔ ہم ادنیٰ سے ادنیٰ اور کمزور سے کمزور لوگ بھی اعلیٰ اقدار کی سیوا کر کے بڑے بن سکتے ہیں۔"

ذاکر صاحب کے محبوب موضوعات اور ان کی فکر کے بنیادی عناصر تخلیق مقاصد، خودی کی پاسبانی، اعلیٰ اقدار کی سیوا ۔۔ اور شخصیت کی تعمیر، یہ سب کچھ براہ راست اقبال کی دین ہے۔

عابد صاحب راوی ہیں کہ "سب سے زیادہ حظ فارسی شاعری سے خصوصاً اقبال کے کلام سے اٹھاتے ہیں۔" عابد صاحب نے ذاکر صاحب کو جھوم جھوم کر دلکش لحن میں اقبال کے شعر پڑھتے سننے کا بھی ذکر کیا ہے[۲]

اقبال کا اثر کتابی تھا، یا بالواسطہ تھا اور اکتسابی؛ براہ راست اور شخصی طور سے کردار اور

---

[۱] متاع فقیر   [۲] اعظمی: ۴۲

سیرت کا اثر اسی عہد کے ایک اور بڑے مسلمان تھے حکیم اجمل خاںؔ ان کا بڑا ان کے بارے میں جس طرح ہیچ نے لکھا ہے ایک بار پھر پڑھیے۔ حکیم صاحب کے بارے میں تفصیلی باتیں تو پھر کبھی، لیکن اتنا تو کہنے ہی دیجیے کہ ایسا سراپا خدمت کا بندہ اس قوم کو مشکل ہی سے ملے گا۔ انگریز کی غلامی پر نارضامندی میں جو شدت تھی، قوم کی خدمت گزاری میں اس سے کچھ زیادہ ہی بات تھی!

خاموش خدمت اور لگن کا جیسا نمونہ حکیم صاحب نے پیش کیا، لوگ کہتے ہیں کہ اس کا مدمقابل بس ایک ہی چیز تھی اور وہ تھی ان کی شرافت، شائستگی اور خاکساری اور وضعداری۔ ذاکر صاحب میں کلچر کی جو نفیس آمیزش تھی، اس میں حکیم صاحب کا حصہ کسی سے کم نہیں ہوگا۔

پھر ڈاکٹر انصاری تھے، حکیم صاحب کے بعد ذاکر صاحب کے دوسرے مخدوم۔ ان پر ذاکر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے کچھ اندازہ کر لیجیے یا کبھی موقع ہو تو خالدہ ادیب خانم نے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ لیجیے، اور قومی تحریک کی کچھ ایماندارانہ تاریخیں اٹھا کر دیکھیے۔ انصاری جیسا دوسرا دیوانہ نہیں ملے گا۔

مولانا محمد علی کی بھی ایک شخصیت بیچ میں آئی تھی، جس سے وقتی طور سے ذاکر صاحب کو کچھ نہ کچھ انسپریشن ملا ہو تو عجب نہیں۔ ہمہ اضطراب، سر تا پا بے چینی، سوز و ساز و درد و داغ، جستجو و آرزو۔ لیکن لگتا ہے ان میں ابال زیادہ تھا گہرائی کم تھی؛ اسی لیے کوئی دیرپا نقش نظر آتا نہیں!

مولانا آزاد کی بات میں نے چھیڑی تھی، لیکن وہ اقبالؔ کے سامنے ماند پڑ گئی تھی، بات کچھ تھی بھی ایسی ہی، ذاکر صاحب پھر سر تا پا اقبالؔ کے حلقے کے آدمی ہو گئے تھے لیکن مولانا کا ایک دیرپا اثر انھوں نے مذہبی فکر کے معاملے میں، غالباً کبھی اقرار نہ کرنے کے باوجود، قبول کر لیا تھا اور وہ تھا "مسلمین بالعمل و الالنظریہ" کہ وہ غیر مسلم جو ایک اچھا اور سچا اور نیک انسان ہے اور دوسروں کے کام آنے والا ہے، قطعی طور سے ایک بدکار بے عمل اور بداطوار مسلمان کے مقابلہ میں اللہ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ بندہ ٹھہرے گا اور ہر لحاظ سے قابل ترجیح بھی۔

مولانا کے دو پسندیدہ مفہوم مجھے اور بھی ملے، جو ذاکر صاحب کے یہاں متعدد بار اور نت نئے ڈھنگ سے آتے رہے ہیں۔ ایک تو انسان کے بنیادی طور سے نیک اور اچھا ہونے

پہ پورا اعتماد:

"گناہوں سے نفرت کرو، مگر انسانوں سے نفرت نہ کرو جو گناہوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اگر ایک انسان گنہگار ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی رُوح و دل کی تندرستی باقی نہ رہی۔ لیکن اگر اس نے بدبختانہ اپنی تندرستی ضائع کر دی ہے تو اس سے نفرت کیوں کرو؟ وہ تو اپنی تندرستی کھو کر اور زیادہ تمہارے رحم و شفقت کا مستحق ہو گیا ہے تم اپنے بیمار بھائی کی تیمارداری کرو گے یا اسے جلاد کے تازیانے کے حوالے کر دو گے؟"

(ترجمان القرآن)

اور دوسرے وقت کے ہیچ ہونے اور باوجود 'سلطانِ کل' ہونے کے بہرحال گزر جانے کی مجبورانہ خصوصیت سے مملو ہونے پر انسانی برتری پر مسرت کا احساس:-

"غور کیجئے تو انسان کی زندگی اور اس کے احساسات کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ تین برس کی مدت ہو یا تین دن کی، مگر جب گزرنے پر آتی ہے تو گزر ہی جاتی ہے۔ گزرنے سے پہلے سوچیے تو حیرانی ہوتی ہے کہ یہ پہاڑسی مدت کیونکر کٹے گی۔ گزرنے کے بعد سوچیے تو تعجب ہوتا ہے کہ جو کچھ گزر چکا وہ چند لمحوں سے زیادہ نہ تھا" (غبار خاطر)

یہ کوئی گہری فلسفیانہ باتیں نہیں ہیں نہ کوئی نظام فلسفہ مبنی ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا ذاکر صاحب کوئی مربوط، مرتب فکر پیش کرنے والے فلسفی قسم کے آدمی تو تھے نہیں، ان کے یہاں تو آپ کو غالب والی باتیں ملیں گی۔ ذاکر صاحب کو پڑھنے والوں کو ان دونوں اقتباسات کی آوازِ بازگشت بار بار سنائی دے گی۔

ذاکر صاحب پر ایک اثر اور بھی تھا:

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل   خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

یہ شعر ذاکر صاحب کو بے حد پسند تھا۔ جب تیس پینتیس سال کے تھے اُس وقت انھیں گنگناتے سنا ہے اور جب ساٹھ ستر سال کے تھے، اُس وقت بھی ایک سے زیادہ بار ان کی زبان سے سنا ہے۔

مس فلپس بورن ذاکر صاحب کے جرمنی کے زمانۂ قیام کی عزیز دوست تھیں، جنھوں

نے ذاکر صاحب کو یورپین موسیقی، مصوری اور بعض دیگر فنون لطیفہ کا شوق لگایا اور INITIATE کیا۔ ذاکر صاحب برلن چھوڑنے لگے تو ان کے پیچھے یہ بھی جامعہ آگئیں اور پھر اپنی ساری عمر جامعہ کے بچوں کی خدمت میں گزار دی۔ مس فلپس بورن کو نہ کسی کی شخصیت ہی کھینچ کر لائی، نہ محض مقصد؛ بلکہ شخصیت اور مقصد کی وہ ہم آہنگی اور مناسبت جو دل میں اعتماد پیدا کرتی ہے اور کامیابی کی امید! یہ تو مس فلپس بورن ہی جانتی ہوں گی کہ جرمنی سے انھوں نے ہندوستان آکر کیا کھویا اور کیا پایا۔ ڈرتا ہوں کہیں بے ادبی نہ ہو جائے، مگر دل نہیں مانتا کہ وہ جامعہ کو ایک بہت بڑے احسان سے شرمندہ کر گئی ہیں۔ انھوں نے زندگی کے بارہ سال ہمارے ساتھ گزارے ان میں وہ برابر تکلیف اٹھاتی رہیں، اور آخر وقت میں بھی جامعہ کی خاطر ایک ایسے حق سے دستبردار ہو گئیں، جس کو وہ اپنا حق سمجھتی تھیں: انھوں نے دل کی تنہائی قبول کی، عشق کو صبر کا کڑوا گھونٹ پلایا، وعدہ کو امید، امید کو حسرت، حسرت کو موت بن جانے دیا، اور کہتی رہیں یہی مناسب ہے!" یہ مس فلپس بورن اور ذاکر صاحب کے مشترک دوست، ذاکر صاحب کے جامعہ کے ساتھی، اور اس سے پہلے جرمنی کے ساتھی کا بیان ہے۔

ذاکر صاحب کی تحریروں میں ان کا ذکر نہیں آتا بس ایک خط میں جو یورپ سے ستمبر ۲۹ء میں لکھا ہے یہ جملہ ملتا ہے:

"آپ کا خط ملا . . . . اسی ڈاک سے ایک شفیق صاحب کا اور ایک میم صاحب کا ملا۔ خون کی جو حالت ہونی چاہیے تھی اس سے بہتر ہے، اس لیے علاج میں سہولت ہے۔ قلب بھی، ستم ظریفی ملاحظہ ہو، بہ جا ہے!"

صرف ایک بار اور وہ بھی ان کے آخری لمحوں میں پھر ان کا نام لیا ہے۔ میرے دوست عبداللطیف اعظمی صاحب کا بیان ہے کہ وہ سرطان کے مہلک مرض میں مبتلا موت اور زندگی کی کش مکش میں گرفتار تھیں اور سخت تکلیف کے عالم میں تھیں، جسے ذاکر صاحب برداشت نہیں کر پا رہے تھے آخری لمحے قریب تر آتے جا رہے تھے۔ ذاکر صاحب کی کتاب "تعلیمی خطبات" چھپ رہی تھی، معاً انھیں اس کا خیال آیا اور گھبرا کر کے اعظمی صاحب کو بلا کے کہا، اگر ابھی کتابوں کی جلد بندی نہیں ہوئی ہو تو انتساب کا یہ صفحہ اس میں اور بڑھوا دیجیے۔ یہ انتساب مس فلپس بورن کے نام تھا، اور اس میں لکھا تھا:

"اس کتاب کے آخری حصے آج چھپ کر آئے ہیں، ان تقریروں میں میں نے جو کچھ کہا ہے، اور جس طرح کہا ہے اس میں آپ کا بہت حصہ ہے

جی چاہتا ہے آپ اجازت دیں تو اس مجموعہ کو آپ کے نام منسوب کروں ۔۔۔"

"آپ ساتھی ۔ ذاکر حسین"

ذاکر صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے :-

"یہ تو میں نہیں جانتا کہ ناکام محبت شخصیت کے کچھ نشان چھوڑ جاتی ہو لیکن ۔۔۔"
ذاکر صاحب اس گون کے آدمی تھے بھی نہیں، وہ محبوب بنائے جانے پرستش کیے جانے کے قابل تھے، خود عاشق تو وہ صرف اپنے کسی نصب العین ہی کے ہو سکتے تھے۔ کتنی دلآویز شخصیت تھی! میں نے ۱۹۳۰ء میں انھیں پہلی بار دیکھا تھا؛ مجھے جب سے اب تک ایسا خوب صورت چہرہ کہیں نہیں ملا ہے ۔ افغانستان کے سرور خاں گویا ۱۹۳۶ء میں ہندستان آئے تھے، صباح الدین عبدالرحمن کا بیان ہے کہ ان کا کہنا تھا " میں نے ہندستان میں حسین ترین آدمی ڈاکٹر ذاکر حسین کو پایا۔" مسز فلپس لوراں نے تو انھیں اس وقت پایا تھا جب وہ ۲۷ سال کے تھے؛ یہ ۱۹۲۴ء کی بات ہے۔ اس سے ۹ سال پہلے ان کی شادی ہو چکی تھی۔ شریف، وضعدار، قدیم روایات و اقدار کے پابند شمالی ہند کے ایک پٹھان خاندان سے وابستہ، یہ نوجوان جو جامعہ کی برادری کا نوعمر قائد ہو کے ہندستان میں اپنا نام قوم کے اکابر کے دلوں میں نقش کر چکا تھا، اور دور افق کے اس پار اپنے لئے کچھ تخلیقی مقاصد بھی کر چکا تھا ---- اس سے کوئی لغزش ہونے کا تو امکان ہی نہیں تھا۔ اپنے آئیڈیل میں کھو جانے کے بعد پھر جذبہ کو کوئی دوسری سمت ملتی نہیں ہے!

صوفی حسن شاہ صاحب نے ایک روز ذاکر صاحب سے پوچھا " کبھی شراب پی ہے تم نے؟" پھر نفی میں جواب پا کر کہنے لگے :-

" مگر میں نے پی ہے۔ اور اگر تمھیں کوئی ایسا پلانے والا مل جائے جس کے ہاتھ سے تمھیں پی جانا چاہیے، تو کبھی انکار بھی مت کرنا۔"

نورانی نے لکھا ہے کہ پوری زندگی ذاکر صاحب کو ایسا واسطہ نہیں پڑا۔ میرا خیال ہے کہ اگر ذاکر صاحب میں کوئی کمی رہی تو یہی۔ میر کے اس شعر کو انھوں نے

پڑھا بہت ہوگا عمل کبھی نہیں کیا:

اے آہوانِ کعبہ نہ اینڈو حرم کے گرد
کھاؤ کسو کی تیغ، کسو کے شکار ہو

وہ ان لوگوں میں تھے جن کی لگن جن سے سب کچھ چھین لیتی ہے۔ اپنے آپ میں گم یہ لوگ اپنے مقاصد اور نصب العین کا ایک مضبوط حرم بنا لیتے ہیں جس کے گرد وہ محفوظ و مامون حصار ہوتا ہے جو مقاصد جلیلہ شخصیت کو IMMUNE بنانے کے لیے چن دیتے ہیں۔ اس حرم کے گرد وہ آہوانِ کعبہ کی مانند پوری بے خوفی سے ساری عمر اینڈتے رہے، اس لیے نہ کسو کی تیغ کے گھائل ہوئے نہ کسو کا شکار بنے۔ ان کے عزیز دوست عابد صاحب نے جوانی کے دور کی رمز پہ شہادت دی ہے کہ "ذاکر صاحب در ایام جوانی جہاں کہ آفت و آفی کی وادی پُرخار سے بڑی پامردی سے گزرے ہیں؛ گھبرا کر بھاگنے کی کوشش میں کانٹوں میں اُلجھے نہیں بلکہ اوسان قائم رکھے دامن بچائے قدم بڑھائے چلے گئے۔"

تاہم سرتاپا جذبات کی شورش، یہ گرم دل نوجوان جو بڑے سے بڑے جذباتی اور اچھے سے اچھے فنکار سے زیادہ حسن پرست تھا، پیار کے لیے کسی کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو جھٹک تو نہیں سکتا تھا۔ "ہم آج سے ہماری بہن ہو اور دوست ہو، چلو جامعہ چلتے ہیں ساتھ کام کریں گے۔" مس فلپس بورن نے ساتھ نبایا اور خوب نبایا۔ ذاکر صاحب کا مذہب قبول کر لیا، ذاکر صاحب کی جامعہ کی خدمت کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا، اور جو وقت بچتا، ذاکر صاحب کی ذاتی پسند و ناپسند کی دیکھ ریکھ میں صرف کر دیتیں ۱۲ سال جامعہ میں گزار کے جہاں ہم نشینی سے اثر پذیر ہو کر ایک تصور کے سہارے زندگی گزار کے ۱۹۴۲ء میں چل بسیں۔

ذاکر صاحب نے انتساب میں کوئی لفظ نہ بھرتی کا لکھا ہے نہ مبالغہ کا! ایک بار اسے پھر پڑھیے۔

اور، ایک بہت اہم اثر تھا، صوفیائے کرام کے لٹریچر کے مطالعہ کا۔ فارسی کے تمام اہم صوفی شاعروں کے مسلسل مطالعہ میں رہتے تھے۔ صوفیا کے ملفوظات، ان کے حالات، ان کی تعلیمات، یہ بھی ان کی نظر سے بار بار گزرتی رہتی تھیں براہ راست اقبال کا فیضان بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ معلوم ہے کہ صوفیا کا مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ تھا،

اس لیے اقدار کی چاکری اور خدمتِ خلق یہ دو تصورات مجھے تصوف کی دین زیادہ لگتے ہیں۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

"کمال شخص کے لیے لازم تو نہیں کہ سعدی کبھی ہو، دوسرے تک پہنچے لیکن خدمتِ خلق میں سچے دل سے لگنے والے جانتے ہیں کہ یہ کام کسی کے کٹانے نہیں کٹتا، چاہے وہ ایک کتنا ہی عظیم المرتبت ہو۔ یہ کام کسی

ایک زمانے میں ختم نہیں ہو جاتا، یہ ہمیشہ کیے جانے اور ہوتے رہنے کا کام ہے۔ اس کے لیے دوسرے کام کرنے والے تیار کرنے پڑتے ہیں اپنی جیسی شخصیتیں بنانی ہوتی ہیں، سینکڑوں اخلاقی شخصیتوں کو گڑھ کر کاڑھ کر ملک کے کونے کونے میں اپنا بنا کر بکھیرا جاتا ہے)"

اپنی شخصیت کی تعمیر سے آگے کی یہ منزل صوفیا کا کام ہے اور انھیں سے سیکھنے کا کام ہے، جو انھوں نے سیکھا۔

خلاصہ یہ کہ نظری طور سے ان کے اصل مرشد اقبال تھے (یا پھر دوسرے درجہ پر ابوالکلام) سیرت پر اثر کا جہاں تک تعلق ہے اجمل خاں جوانی میں اور اٹاوہ کے الطاف حسین بچپن میں اور پھر ماں کی محبت کی مہمیز، باقی جتنے نقوش ابھرے قلندرین کھلنڈراپن، رسک لینے کا شوق، یہ سب علی گڑھ کا عطیہ ہیں جہاں انھیں اعلیٰ دانش گاہ ملی اور اچھے دوست۔ جذبہ اور لگن کا جہاں تک تعلق ہے اس میں مولانا محمد علی کا بھی کچھ حصہ ہو سکتا ہے، اور خاموش کام عزم اور پختہ ارادے اور استواری کے ساتھ کام کا جہاں تک تعلق ہے جامعہ کے ساتھیوں، عابد صاحب اور شفیق صاحب وغیرہ پر جس طرح ذاکر صاحب نے اثر ڈالا کیا انھوں نے اپنی کوئی پرچھائیں ذاکر صاحب پر نہ ڈالی ہو گی؟ اور ایک مستقل مہمیز کے لیے جامعہ ہی سے وابستہ شدہ ایک جرمن خاتون کی شخصیت تھی جو ذاکر صاحب سے متاثر ہو کر اپنی ساری کشتیاں جلا کے برلن سے جامعہ کی ویران بستی میں آ بسی تھیں:

تو نے بخشی مجھے بے نام تمنا کی خلش
دل تجھے کھو کے بھی ناشاد نہ ہو پایا کبھی

متن

تحریروں کی تاریخیں، مأخذ اور اشاریہ

۱

"از مسٹر ذاکر حسین خاں متعلم مدرسۃ العلوم"

باب وہ لقب ہے جو ایک شیرازی سید مرزا علی محمد نے اختیار کیا تھا۔ ۱۲۶۰ھ میں اس نے ایک نئے مذہب کا وعظ شروع کیا۔ یہ مذہب باوجود سخت سے سخت سزاؤں اور بانی کے قتل کے اب تک حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ایران میں پھیل رہا ہے۔ اس مذہب کی تاریخ اور مسائل میں کچھ ایسی خاص باتیں ہیں کہ ابتدا ہی سے اس نے نہ صرف ایشیا بلکہ اقوام یورپ و امریکہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی ہے۔ اور اس کے متعلق اس قدر کتابیں تصنیف کی گئی ہیں کہ ایک محنتی سے محنتی طالب علم کے لئے مشکل ہے کہ وہ ان میں سے تھوڑی سی ہی پورے طور پر ختم کر سکے ...

... کسی زمانے اور کسی ملک میں قرۃ العین جیسی عورتوں کا پیدا ہونا بہت شاذ ہے اور خصوصاً ایران جیسے ملک میں اس کا پیدا ہونا ایک حیرت انگیز واقعہ نہیں بلکہ معجزہ ہے کیا بلحاظ اپنے حسن و جمال کیا بلحاظ اپنی ذہنی لیاقت کیا بلحاظ اپنی اور کیا بلحاظ اپنے مذہب کی بیباکانہ محبت کے وہ ایران میں اپنی ثانی آپ ہے۔ اگر مذہب بابی کے پاس فخر کرنے کے لئے کوئی اور بڑی چیز نہ ہوتی تو اس کے لئے یہی کافی تھا کہ اس نے قرۃ العین جیسی ایک عورت پیدا کر دی ...

(اوّلین تحریر: ۱۹۱۵ء)

صدر جمہوریۂ افلاطون

دنیا کے سب سے بڑے مصنف کی سب سے اہم کتاب کو اردو زبان میں پیش کرتے ہوئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں ہے۔

.... فلاطون سمجھتا تھا کہ یہ جمہوری ریاست ایک بے ملاح کی ناؤ ہے، کہاں دیکھئے تھے .... وہ ان سب چیزوں کو دیکھتا اور سوچتا، سوچتا اور دیکھتا لیکن اس نے نتائج پر پہنچنے میں عجلت سے کام نہیں لیا، شاید اس وجہ سے کہ اس کا عہد یونانی تاریخ کا وہ زمانہ ہے جب جماعتی زندگی نے گویا اپنے معراج کمال کو پہنچ کر روبہ زوال ہونا شروع ہی کیا تھا، اور ان زوال آمادہ اداروں کا بھرم ابھی اچھی طرح کھلا نہ تھا۔ اس لئے آثار زوال کا احساس بھی نہ بہت قوی تھا، اور نہ بہت واضح۔ ابھی علم وفن، شاعری اور ناٹک، تعمیرات اور صورت تراشی، غرض ذہنی زندگی کے سارے مظاہر نہایت اچھی شکل میں سامنے موجود تھے، کھلی خوبیوں کے سامنے چھپی برائیوں پر نظر پہنچ بھی جائے تو آدمی انکیں آسانی سے درست کرنے کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ واقعہ کے مقابلہ میں خیال، اور موجود کے مقابلے میں موہوم کے لئے کوئی عجلت سے آمادۂ عمل کیسے ہو!

.... ابھی اس کے ذہن کی گرہ نہیں کھلی تھی، اس کی روح کی کلی نہیں کھلی تھی۔ سیرت کا ہیولا تشکیل کے لئے بیتاب تھا، اور ذہنی زندگی اپنے مرکز کی تلاش میں بیقرار .... جس زندگی کے ساز کو کسی دوسری زندگی کا مضراب نہیں چھیڑتا اس کے نغمے خاموش ہی رہتے ہیں، جس زندگی کی کلی کو دوسری زندگی کی حیات بخش شبنم نصیب نہیں ہوتی، وہ شگفتہ ہونے کی جگہ مرجھا جاتی ہے ....

روایت ہے کہ اس نے سقراط سے ملنے کے بعد اپنی شاعری کا سارا دفتر سپرد آتش کردیا۔ نہ جانے ادب عالم کو اس سے کیا ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہوگا! مگر شاعری کا کیسا ہی نقصان ہوا ہو، انسانیت کو ایک انسان مل گیا جس کی ذہنی قوت کے ارتعاش آج تک بنی نوع انسانی کی حیات ذہنی وعملی دونوں کے لئے تموج اور حرکت کا باعث ہیں ....

عملی سیاست سے دل برداشتہ ہونے کے لئے اتنی ہی پیہم ناکامیوں اور مایوسیوں کی ضرورت تھی! اس کے بعد فلاطون نے کبھی عملی سیاست میں

حصہ نہیں کیا۔

.... فلاطون کا مرکزی مسئلہ یہ ہے کہ آدمی اچھا آدمی کیسے بنے؟....

اس انفرادیت کے بجائے جو جمہوریت کے پردے میں پھیلی ہوئی تھی، فلاطون اجتماعی تعاون کا پیام دیتا ہے، اور اس کی تکمیل کے لئے تخصیص کار کا اصول پیش کرتا ہے، تاکہ ہر فرد اور ہر طبقہ اپنے فرض مفوضہ کو قناعت اور خوش دلی سے انجام دیتا رہے، اپنا دھرم پورا کرتا رہے کہ فلاطون کی نظر میں یہی اجتماعی زندگی کا سچا اصول یعنی عدل ہے، اسی وجہ سے ریاست کا دوسرا نام تحقیق عدل بھی ہے۔

اس تخصیص کار کو کامیاب بنانے کے لئے لازمی ہے کہ ہر فرد اور ہر طبقہ کو اس کے وظائف مخصوص کے لئے تیار کرنے کا انتظام کیا جائے۔ یہ تعلیم کا کام ہے، چنانچہ فلاطون اس کتاب میں تعلیم کا مفصل نظام پیش کرتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ ریاست درحقیقت تعلیمات پر ایک مقالہ ہے!

.... اس نظام تعلیم کی تفصیلی بحث کے بعد فلاطون محسوس کرتا ہے کہ اسے کامیابی کے ساتھ عمل میں لانے کے اور مستقل بنانے کے لئے اجتماعی زندگی کے بہت سے اداروں کو بدلنا ضروری ہے، چنانچہ معیشت کا ایک اشتراکی نظام تجویز کرکے گمراہیوں کا سدباب کرتا ہے....

.... پھر وہ بتلاتا ہے کہ اگر ریاست میں عدل مختلف طبقوں کے اپنے اپنے فرائض انجام دینے کا نام ہے تو انفرادی زندگی میں یہ اس سے عبارت ہے کہ روح کے اجزا ثلاثہ اپنا اپنا کام انجام دیں، اور عقل، جذبات اور شہوات اپنی اپنی حدود میں کارفرما ہوں، اور شخصی زندگی ان میں مناسب ہم آہنگی اور توازن پیدا کرے....

.... لیکن افلاطون پھر انتہا کا خوش مذاق اور وسیع النظر شہری تھا۔ ادب اور موسیقی سے سیرت کی جو تربیت اور تہذیب ہوتی ہے اس سے افلاطون سے زیادہ اور کون آشنا ہو سکتا تھا۔ یہ بھلا اپنی ریاست میں محض اکھڑ سپاہی بنانے پر کیسے قناعت کر لیتا!

.... موسیقی، ادب اور فنون لطیفہ کو نصاب کا جزو بنایا اس لئے کیا کہ ان کی دلکشی خود بخود نوجوان روحوں کو اپنی جانب کھینچتی ہے، شعر کے وزن اور بحر سے، چنگ و رباب کی سامعہ نوازی سے، حسین مجسموں کے حسن صورت اور دلفریبی الوان سے روح آپ ہی آپ متاثر ہوتی ہے اور اس طرح ان کی اخلاقی تعلیم کو بے جانے بوجھے

قبول کرتی جاتی ہے۔

افلاطون فنون لطیفہ کی اس تاثیر کو اخلاقی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ موسیقی، شعر اور صورت تراشی کے ہر طرز کو نوجوانوں کی تعلیم کا جزو نہیں بننے دیتا، بلکہ صرف ان طرزوں کو جن سے روح کی صحیح اخلاقی تربیت ہو سکے۔ چنانچہ ریاست میں نظام تعلیم کے ساتھ ادبیات اور موسیقی کے احتساب کا بھی ایک مکمل پروگرام پیش کیا گیا ہے۔

عجب ستم ظریفی ہے کہ دنیا کے اس سب سے بڑے ادیب کے ہاتھوں جس کی ہر ہر سطر سے شعریت ٹپکتی ہے، جو اپنی تصانیف اور اپنی زندگی میں آرٹ کا مظہر معلوم ہوتا ہے، ادب، موسیقی اور آرٹ کی آزادی سلب کرنے کی ایسی ایسی تجویزیں تیار ہوں....

اس کی نظر میں آرٹ ہے وہی جو جماعت کے مقاصد میں ممد ہو۔ وہ زندگی میں اصول خیر کی کارفرمائی دیکھتا، اور ساری کائنات میں ایک مقصد مضمر پاتا ہے، آرٹ چونکہ زندگی اور کائنات کی تعبیر و ترجمانی کا نام ہے اس لئے اسے بھی اس خیر مطلق کا پرتو ہونا چاہئے جس سے زندگی اور کائنات معمور ہیں۔

(۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۳ء)

جنیوا سے ایک خط

برادرم عابد صاحب تسلیم!

آپ کا خط مجھے اس روز ملا جب میں جرمنی سے بھاگ رہا تھا۔ اسی ڈاک سے ایک شفیق صاحب کا اور ایک خط میم صاحب کا ملا۔ ان خطوط سے ادھر کا حال اتنا تو معلوم ہو گیا کہ چند ہفتے صبر سے گزار سکتا ہوں، اس سے پہلے کسی بندۂ خدا نے خبر نہ لی۔ شفیق صاحب نے، مجیب صاحب، اکبر صاحب اور سعید صاحب کے مفصل خطوط کا حوالہ دیا ہے جو مجھے نہیں ملے۔

میری کہانی سنئے ـــــ ۳ر جولائی کو وینس پہنچا، شہر پسند آیا وہیں رہ پڑا۔ دو دن کی جگہ دس دن وہاں رہ گیا۔ بہانہ یہ تھا کہ اطالوی زبان سیکھ رہا ہوں۔ واقعی سیکھتا بھی تھا۔ لیکن سیکھنے میں جتنی دیر لگی بھلانے میں اس سے کم لگے گی۔ ۱۸ر جولائی کو جنیوا پہنچا۔ وہاں امتیاز آ گئے ان کے ساتھ ایک ہفتہ کے لئے ڈرابلیٹ

چلا گیا - بڑا ہی گٹھا ہوا شہر ہے واقعی خوبصورت تقریباً ہر شخص جرمن بھی جانتا ہے۔ وہاں سے پھر وینا واپس آئے - مگر ہوائی جہاز پر! یہ ارمان بھی کیوں رہ جاتا۔ وینا سے پھر امتیاز تو چلے گئے اور مجھے ڈاکٹروں کے سپرد کر گئے - ڈاکٹروں نے وہ وہ معائنے کئے کہ معاذ اللہ - در گفتن نمی آید - قرار پایا کہ آنکھیں اب جو کچھ ہیں وہ ٹھیک ہیں - احتیاط رہے تو کام چلتا رہے گا - آنتیں البتہ بہت خراب ہیں - پرانی پیچش ہے اور خوب ہے - اس کی وجہ سے جگر بھی خراب ہے - اور گردے بھی متاثر ہو چلے ہیں - زیادہ ڈھیل کی گنجائش نہیں - قاعدے سے تو حالت خراب ہونی چاہیئے تھی لیکن یہاں سب کچھ بے قاعدہ ہو رہا ہے ، اس لئے ابھی موقع ہے۔ علاج ہو سکتا ہے - خون کی جو حالت ہونی چاہیئے تھی اس سے بہت بہتر ہے - اس لئے علاج میں سہولت ہے - قلب بھی دستم ظریفی ملاحظہ ہو!) بڑھا ہے - دماغ کا معائنہ نہیں ہوا - ورنہ شاید کچھ دلچسپ نتیجہ برآمد ہوتا - علاج سے زیادہ پرہیز کی تاکید کی گئی ہے - سات انجکشن تجویز کئے گئے اور حکم ملا کہ گسنگن چلے جاؤ - وہاں ۳ ہفتہ رہو - انجکشن لو ، پرہیز کرو - اس کے بعد خون کا معائنہ کراؤ - اگر انجکشن کی وجہ سے خون میں کچھ کمزوری آ گئی ہو تو ۴ - ۵ ہفتہ کا وقفہ دے کر پھر انجکشن لینا ورنہ ۳ ہفتہ کا وقفہ کافی ہوگا - چنانچہ میں ۱۵ ر اگست کو گسنگن

پہنچا - چھوٹی سی جگہ ہے باشندے سب پردیسی ، اور بیمار - چاروں طرف پھولوں کی بھرمار - یہ جگہ مجھے بہت پسند آئی - وینا سے ڈاکٹر نے ایک مفصل وصیت نامہ ساتھ دیا تھا اور ایک اور ڈاکٹر کے نام تعرفی خط - انھوں نے اسی دن سے علاج شروع کر دیا ایک مکان میں رکھ دیا جہاں بھٹیارن خود ڈاکٹر تھی۔

اور ایک ڈاکٹر کی بیوہ اور بڈھی! یعنی تجربہ کار - اس نے پرہیز کا پورا پورا انتظام کیا - چند ہی روز میں مبین فائدہ محسوس ہونے لگا - لیکن فلک کج رفتار کو کیا کہئے - لڑائی کی خبریں آنے لگیں - آدمی گھوڑے ، گاڑیاں ، موٹریں سب ضبط ہونے لگیں - ۲۵ ر اگست کو سب تیاری ہو چکی تھی - ہمارے نوکر سب فوج میں جا چکے تھے - بیمار ساتھی سب بھاگ نکلے تھے - ریلیں کم ہو گئی تھیں - مگر ہم تھے کہ ڈٹے رہے - اور کرتے بھی کیا - انجکشن پورے نہیں ہوئے تھے طبیعت برابر صحت کی طرف مائل تھی - ہم نے طے کیا کہ فی الحال جنگ نہ ہو گی - اس اطمینان کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۶ ر اگست کو خاکسار کے بطن سے (ایک زندہ وجود تولد ہوا !! یعنی)

ایک عدد عظیم الشان کیڑا، طول جس کا کوئی ۹ انچ تھا، برآمد ہوا، بیچش کے علاوہ یہ بزرگ بھی سالہا سال سے (اندرون خانہ مقیم) موجود تھے۔ انھیں گرفتار کیا اور ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ انھوں نے اس کا لاطینی نام بتایا جو مجھے یاد نہیں رہا اور کہا، بہت اچھا ہوا کہ یہ نکل گئے۔ . . . بہت پرانا ہے۔ خیر یہ بھی ہوا۔ ہم خوش ہوئے کہ علاج کامیاب ہو رہا ہے، اور اچھے رہے۔ پہلی ستمبر کو انجکشن ختم ہو گئے، اعمال جو تجویز کئے گئے تھے، وہ بھی پورے ہو گئے۔ اور دو تاریخ تک اعلانِ جنگ برطانیہ نے کر ہی دیا۔ ہمیں اس روز تک بس یہ معلوم تھا کہ صلح کی بات چیت ہو رہی ہے۔ اور پوری امید تھی کہ پرامن طریقہ پر معاملہ یکسو ہو جائے گا۔ حالت جنگ کا اعلان ہمیں سو کو سہ پہر میں سنایا گیا۔ اتوار کا دن تھا۔ اسی وقت اسٹیشن گیا۔ معلوم ہوا پہلی گاڑی جو مل سکتی ہے وہ صبح ۵ بجے ہے۔ واپس آ کر حساب چکایا سامان باندھا۔ رات کو دس بجے جا کر سامان اسٹیشن پہ دیا اور ٹکٹ خریدا صبح ۵ بجے روانہ ہو گیا۔ ریلوں کا انتظام کچھ یوں تھا کہ ایک حلقہ والا دوسرے حلقہ کی خبر نہ دیتا تھا، بس اس حلقہ میں گاڑی کا حال معلوم ہو سکتا تھا۔ وہ بھی غیر معین طور پر ———

میں نے سوئٹزرلینڈ کا قصد کیا۔ کہا گیا کہ اسٹٹگارٹ تک جا سکتے ہو، آگے معلوم نہیں۔ خیر اسٹٹگارٹ کا ٹکٹ لیا۔ راستہ میں تین جگہ گاڑی بدلنی تھی دو دفعہ بدل چکا تھا۔ تیسری جگہ پہنچنے سے پہلے ایک مقام پر بشارت ملی کہ یہ گاڑی آگے نہیں جائے گی۔ سب مسافر اتر جائیں۔ اتر گئے، ۸ گھنٹے وہاں پڑے رہے۔ چھوٹا سا اسٹیشن، ہوائی جہازوں کے ڈر سے تاریک۔ بس ہر گھنٹہ دو گھنٹہ میں ایک گاڑی گذر جاتی تھی جس میں سرحدی مقامات کے بڈھے بچے ہوتے تھے جنھیں اندرون ممالک بھیجا جا رہا تھا۔ خیر یہ وقت بھی گذر گیا اور ہم اسٹٹگارٹ پہنچے۔ وہاں کہا کہ نیورمبرگ جانا ہے۔ معلوم ہوا کہ گاڑی ابھی جا رہی ہے، سامان پوچھا، معلوم ہوا ساتھ نہیں آیا۔ اسی دریافت کرنے میں اسٹٹگارٹ کی گاڑی روانہ ہو گئی۔ رات وہیں قیام فرمایا۔ قاعدہ سے سرکاری مہمان ہو جانا چاہئے تھا، مگر مہمان نوازی نہ معلوم کیوں نہیں کی گئی۔ دوسرے دن نیورمبرگ کا ٹکٹ لے کر روانہ ہوا۔ جرمن علاقہ میں لیک کانسٹنس کے کنارے فریڈرش ہافن پر اترا وہاں سے اسٹیمر لینا ہوتا ہے رات کو پہنچا تھا دوسرے دن تین بجے دن کے اسٹیمر جانے والا تھا۔ راستہ میں معلوم ہوا کہ اسٹیمر چلنا پھر بند

ہوگئے، آگے نہ جا سکو گے۔ مگر یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اسٹیمر پھر چلنے لگے ہیں۔ سہ پہر
میں اسٹیمر پر پہنچا۔ جرمن پولیس نے کہا تم کو سوئزرلینڈ والے جہاز سے اترنے نہ
دیں گے، صبح ہی ۵۰ آدمی اس ساحل سے واپس بھیجے گئے ہیں! میں نے کہا آپ
تو جانے دیں میں قسمت آزمائی کروں گا۔ مسکرائے، کندھے اُچکائے، اور پاسپورٹ
پر مہر لگا دی۔ میں اسٹیمر پہ بیٹھ رومانشہم پہنچا۔ اسٹیمر جس میں ۴۰۰ آدمیوں
کی جگہ تھی اس پہ عملہ کے علاوہ بس تین آدمی اور تھے۔ میں اور دو جو فوجی خدمت
کے لئے جرمن سے اپنے ملک واپس جا رہے تھے۔ کپتان نے پوچھا کہ تم نے ویزا لے
لیا ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ کہا پھر کیسے چلتے ہو، یہ جہاز اسی لئے تو خالی جا رہا ہے
کہ رات کے ۱۲ بجے سے ہماری حکومت نے باہر سے آنے والوں کے لئے بلا استثنا
ویزا کی قید لگا دی ہے اور اس کی سختی سے پابندی ہو رہی ہے۔ یہ گفتگو اس وقت
ہوئی کہ جہاز چل چکا تھا۔ میں نے کہا کہ اب میں تو چل کھڑا ہوا ہوں، فرمایا کہ نہیں واپس
جا سکتے ہو۔ پھر اس جہاز پہ واپس ہو جانا اور جرمنی میں فلاں مقام پر جا کر ویزا
کے حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ میں نے کہا حضرت اب یہ تو ہوتا نہیں۔ ایک دفعہ
جرمنی سے نکل آنے کے معنی یہ نہیں کہ دوبارہ ان کی مہمانی کی آزمائش کروں خیر
اسی گفتگو میں رومانشہم پہنچے وہاں وہی پیش آیا جو کپتان نے کہا تھا۔
سرحدی پولیس نے کہا واپس جاؤ۔ میں نے کہا ناممکن۔ یہیں قید کر لو۔ کچھ دیر تو وہ
اصرار کرتا رہا کہ حکم تو حکم ہے واپس جانا ہی ہوگا۔ مگر جب میری طرف سے بھی انکار
ہوتا رہا تو کہنے لگا کہ تم بات تو ٹھیک کہتے ہو۔ جرمنی واپس جاؤ گے تو تمہیں وہاں
قید کر لیں گے۔ تمہیں واپس بھیجنا تو نا انصافی ہے۔ میں کیا آپ ہی سمجھئے۔ چنانچہ اس
نے برن کو ٹیلیفون کیا۔ وہاں سے مجھے اجازت مل گئی۔ اور میں زیورچ پہنچا۔
وہاں برطانوی کا قنصل نے مشورہ دیا کہ جنیوا جاؤ۔ انگلستان
جانے یا اٹلی سے ہندوستان واپس جانے کے متعلق وہیں سے زیادہ آسانی رہے
گی۔ چنانچہ میں ۹ کو یہاں پہنچ گیا۔ یہاں ڈاکٹر ککول سے ملاقات ہوگئی۔ وہ
اتفاق سے اسی ہوٹل میں ہیں جس میں میں آکر ٹھہرا ہوں۔ اب یہاں اطمینان ہے۔
چند روز کی اس دوڑ بھاگ میں رنگ روغن ویسا نہیں رہا جیسا کنگن
میں ہوگیا تھا۔ مگر ویسے بھلا چنگا ہوں، خوب سوتا ہوں، خوب کھاتا ہوں اور ہضم
کرتا ہوں۔ اور کیا چاہیئے۔ وقفہ گذار کر پھر کہیں نہ کہیں انجکشن لینے کا انتظام کروں

گا۔ اور اگر اٹلی غیر جانبدار رہا تو انشاء اللہ اکتوبر کے ختم تک آپ لوگوں سے آملوں گا۔ مجھے امید ہے کہ روپیہ کی اور ضرورت نہ پڑے گی۔ لیکن آپ اگر ۲۰۔۳۰ پونڈ کا انتظام رکھیں تو اچھا ہے۔ شاید ضرورت پڑ جائے تو میرا تار ملنے پر آپ بھیج سکیں۔

اس خط کے مضمون سے سب احباب کو مطلع کر دیجئے گا اور یوسف اور محمود کو بھی۔ مجھے یہاں پہنچ جانے کی سب سے زیادہ خواہش اس وجہ سے تھی کہ آپ لوگوں کی خیریت معلوم ہوتی رہے گی۔ دیکھئے یہ قیاس صحیح نکلتا ہے یا نہیں۔

(۱۱ ستمبر ۱۹۳۹ء)

۱۷ سال

۱۷ سال عمر کے گزر گئے۔ کیسے گزرے، اچھے گزرے یا برے، اس کا مطالعہ مشکل ہو گا۔ دوست احباب دوستی یا محبت سے یہ سمجھتے ہیں کہ اچھے گزرے، بدخواہ بدنیتی سے یہ سمجھاتے ہیں کہ اچھے گزرے، میرے لئے خصوصیت کے ساتھ یہ مشکل اس لئے ہے کہ میں نے کبھی اپنی زندگی کے کام کو اس طرح پیش نہیں کیا کہ وہ اچھا ہے یا برا، کہ میں نے اپنے آپ کو یا اپنے کام کو کبھی اہمیت ہی نہ دی! (۱۶ مئی ۱۹۶۸ء)

۲

حکیم صاحب

گیارہ سال سے اوپر ہوتے ہیں علی گڑھ کالج میں پڑھتا تھا اور ہندوستانی تعلیم گاہوں میں طلباء کی جو تقسیم "کھیلنے والوں" اور "پڑھنے والوں" میں کی گئی ہے اس کے مطابق "پڑھنے والوں" میں تھا۔ صحت ظاہر ہے ہمیشہ خراب رہتی تھی۔ طب جدید کی توجہات جب کچھ مدد نہ کرسکیں تو خیال ہوا کہ یونانی علاج کرایا جائے اور یونانی علاج کے لئے اس کے سوا اور کوئی کیا مشورہ دیتا کہ اس فن کے امام بلکہ اس کے مسیحا کے پاس جاکر درماں طلبی کی جائے۔ حکیم صاحب (اس حکیم ملت کے لئے بس یہی لقب کافی تھا) کے پاس جانے کا ارادہ تو کرلیا، لیکن بتایا گیا کہ بے سفارش نہ جانا، بڑا دربار ہے، توجہ نہ ہوگی۔ تیاری میں کئی ہفتے گذر گئے۔ بالآخر میرے مخدوم بشیر الدین صاحب کو معلوم ہوا تو وہ خود اپنے ہمراہ مجھے دہلی لائے، مطب میں پہنچے۔ مریضوں کا ہجوم تھا ۱۱، ۱۲ بجے تک مطب ہوتا رہا۔ جب اٹھے تو مولوی بشیر الدین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھیں سہ پہر کو چائے پر بلایا۔ میں بھی ساتھ پہنچ گیا۔ لیکن کچھ اور لوگ بھی تھے، نبض دیکھنے کی نوبت نہ آئی۔ دوسرے روز مطب میں بلایا۔ پھر وہی اژدہام تھا، کوئی ۱ بجے نوبت آئی۔ نسخہ لے گیا اور وہیں علی گڑھ واپس گیا۔ سفارش کے باوجود دو روز تک انتظار کرنے سے طبیعت بالکل مکدر نہ ہوئی، بلکہ مریضوں کی کثرت، ہر کونہ، ہر گوشہ میں درماں جویوں کا ہجوم، مکان کے دروازے تک، موٹر میں بیٹھنے کے بعد تک نبض دکھانے والوں کا ہاتھ بڑھا دینا، یہ سب باتیں دیکھ کر اس بڑے آدمی کی بڑائی اور دل میں بڑھتی تھی۔ لیکن یہی عظمت کہ بڑا دربار ہے، اثر دینا ہی کا

یہاں گذر ہے، بلا وسیلہ وسفارش حکیم صاحب سے علاج کرانا مشکل ہے۔

لیکن گیارہ سال بعد جب جامعہ کے کاموں کی وجہ سے میں تقریباً اپنا تمام وقت جو جامعہ سے بچتا تھا، اسی دربار میں گذارنے لگا تو معلوم ہوا کہ یہ خیال ٹھیک نہ تھا سفارش والے یہاں سب سے پیچھے رہتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ تنگ اور تاریک گلیوں میں، میں ساتھ گیا ہوں، کسی ٹوٹے مکان کے دروازے پر کھڑا رہا ہوں اور دنیا کا یہ سب سے بڑا طبیب، نوابوں کا نواب کسی بڑھیا کو دیکھنے اندر گیا ہے جس کی عسرت کا یہ حال ہے کہ مجھ ہمراہی کے لئے بیٹھنے کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی تھی۔ جب گھر سے نکلتے ہیں تو مسکراتے ہوئے کہ آپ کو بہت دیر ٹھہرنا پڑا۔

۲۱ر دسمبر کی شب کو تین چار روز تک درد کی وجہ سے بستر پر لیٹے لیٹے مشکل سے اٹھ کر بیٹھے اور دوسرے روز صبح باوجود اس تکلیف کے بمبئی کے سفر کا قصد کیا کہ شاہ افغانستان کی خدمت میں جامعہ کا ایڈریس پیش کر سکیں تو میں بھی پاس بیٹھا تھا۔ رات ہو چکی تھی مگر مریض آ آکر نسخے لے رہے تھے جب سب جا چکے تو اپنے ایک شاگرد کو بلا کر فرمایا کہ کل کچھ لوگ نبض دکھانے آئے تھے اور آج صبح بھی انتظار کرتے رہے، میں نہ دیکھ سکا، بیچارے غریب لوگ ہیں، وضع سے معلوم ہوتا تھا کہ بمبئی سے آئے ہوں گے، ذرا جا کر قریب کے ہوٹلوں میں تلاش کرو، اور مل جائیں تو لے آؤ اور ان کے لئے بھی نسخہ تجویز کر دوں۔ یہ اور اس قسم کے سیکڑوں واقعات اس وقت میرے ذہن میں ہیں، جو صاف ظاہر کرتے ہیں کہ یہ نواب، غریبوں اور لاوارثوں، بے وسیلوں کا عاشق تھا، اور یہ خیال بالکل غلط تھا کہ اس کے دربار میں بے وسیلہ رسائی نہیں۔

میں نے ان واقعات کا اس لئے ذکر کیا کہ حکیم صاحب کی عظمت اور بڑائی قریب سے دیکھنے پر اور بڑھتی تھی اور دور سے دیکھنے والے جس وجہ سے انھیں بڑا سمجھتے تھے، قریب والے بالکل دوسری وجہ سے انھیں اس سے زیادہ بڑا جانتے تھے (بڑے لوگوں کو اپنی بڑائی قائم رکھنے کے لئے دنیا میں اکثر چھوٹوں سے الگ، چھپا ہوا، کھنچا ہوا رہنا پڑتا ہے) اور ٹھیک بھی ہے۔ قریب سے دیکھنے والے پر بہت سی وہ چھوٹی چھوٹی خامیاں ظاہر ہو جاتی ہیں جو دور والے کو نظر نہیں آتیں۔ حکیم اجمل خاں ان بڑوں میں تھے جو قریب سے اور بڑے ہو جاتے ہیں، دور سے دیکھنے والے جن کی عزت کرتے ہیں اور قریب سے دیکھنے والے جن پر عاشق ہو جاتے ہیں۔

یہ نادر وصف صرف ان بڑے آدمیوں میں ہوتا ہے جو صرف بڑے نہیں ہوتے

بلکہ آدمی بھی ہوتے ہیں۔ یہ انسانیت کی صفت مرحوم میں جس درجہ موجود تھی میں نے اور کسی میں نہ پائی۔ وہ ایک ایسی شخصیت تھی جس کے ہر ہر جز میں وہ تناسب اور ہمواری تھی جو کسی ایک جز میں حاصل ہو جائے تو وہ آدمی کو بڑا بنا دیتی ہے۔ جس تمدن میں انسان زندگی بسر کرتا ہے اس کے کسی ایک شعبہ کا بھی کمال اگر اس کی ذات میں موجود ہو تو وہ اپنی جماعت کے لئے باعث فخر ہوتا ہے۔ لیکن یہ ایک ذات تھی جس میں ہندی اسلامی تمدن کے ہر شعبے کا کامل نمونہ موجود تھا اور یہ بھی نہیں جدید تمدن کے اچھے اثرات موجود نہ ہوں؛ قدیم تمدن کی گہرائی اور پختگی اور جدید کی بیداری اس ایک ذات میں آکر مل گئی تھیں۔ اور افسوس کہ دوسروں میں اس اتحاد کو آنکھیں بے سود تلاش کرتی ہیں کہ پرانوں میں قدامت بے حسی اور موت بن گئی ہے، نئوں میں جدت نے سطحیت اور اتھلے پن کی شکل اختیار کی ہے؛ پرانے تمدن کی جڑیں ہماری زندگیوں میں اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سخت چٹان پر پہنچ گئی ہیں جس سے وہ غذا حاصل نہیں کر سکتیں، ہمارے نئے تمدن کی مثال خوش نما پھولوں کے اس گلدستے کی سی ہے جو درخت سے توڑ لئے گئے ہیں اور اگرچہ ابھی بہت شاداب نظر آتے ہیں لیکن ان میں جڑیں نہیں اس لئے ان میں ثبات بھی نہیں۔

ایک اجمل خاں کی ذات تھی جس کی جڑیں تمدن اسلامی کی گہرائیوں میں تھیں اور جس کے پھل پھول دیکھ کر نئے باغوں کے پھول بھی شرما جاتے تھے۔ ہر شعبۂ تمدن میں طب ہو کہ علم سیاست ہو، معاشرت و مذہب ہو کہ فنون لطیفہ، وہ سب میں مقلد بھی تھا اور مجتہد بھی۔ پچھلے جو دے سکتے تھے وہ سب اس نے لیا لیکن یہ خیال کبھی ذہن سے نہ ہٹا کہ اگلوں کو کچھ اور دے بھی جائے۔ اس کی غیور طبیعت کو کبھی یہ گوارا نہ تھا کہ ماضی کا قرض بلا معاوضہ حال کی گردن پر رہے۔ اس لئے اس کی نظر ہمیشہ مستقبل پر تھی۔ طبیہ کالج کو دیکھو، ندوۃ العلماء کے اجلاس میں اس کے خطبۂ صدارت کو پڑھو، جامعہ ملیہ کے اس تخیل سے آگاہی پیدا کرو جو مرحوم کے پیش نظر تھا اور جس کی تکمیل کی سعی میں ان کی آخری سانسیں گذریں تو معلوم ہوگا کہ یہ دماغ کسی بڑے طبیب یا عالم یا سیاسی کا دماغ نہ تھا بلکہ ایسا دماغ تھا جو صرف ان لوگوں کو ملتا ہے جن سے قدرت مستقبل کی تعمیر کراتی ہے۔ آج اجمل خاں ہم سے جدا نہیں ہوئے، ہندوستان اور مسلمانوں کے مستقبل کا سب سے بڑا معمار ہم میں سے اُٹھ گیا۔ پرانی نسل اجمل خاں میں اپنے آخری کامل نمونے کو رو رہی ہے اور نئی نسل اپنی دنیا کے ایک خلاق اور اپنی ممکنات کے مظہر

کے ایک تشکیل دینے والے کے لئے نوحہ کناں ہے۔

دنیا میں بہت بڑے بڑے مرنے والے واقعی مرجاتے ہیں جب ان کا رشتہ صرف ایک ہی نسل سے ہو۔ لیکن ماضی اور مستقبل دونوں سے رشتہ رکھنے والے نہیں مرتے۔ اور اجمل خاں انہیں نہ مرنے والی ہستیوں میں ہیں۔

جب موجودہ زمانے کے فن طب یونانی کا بڑا حصہ نامکمل اور ناقص ثابت ہوچکا ہوگا (اور کون سا فن ہے جس کا نقص زمانہ ثابت نہیں کرتا!) تو دلی کے ایک دور افتادہ گوشہ میں ایک طبیہ کالج کے طلبا اور اساتذہ ایک نئے فن طب کی تدوین وتخلیق میں مصروف ہوں گے اور ان کے کالج کے در و دیوار پر اور خود ان کی زبان پر حکیم اجمل خاں کا نام ہوگا۔ جب "تعلیم جدید" کے حامی اپنی کوششوں کی مضرت سے واقف ہوچکے ہوں گے تو ملک میں متعدد تعلیم گاہیں اور تحقیقی ادارے ایسے ملیں گے جو اپنی کوششوں میں قدیم وجدید کا وہی امتزاج پیدا کرنا چاہتے ہوں گے، جو اجمل خاں کی زندگی میں نمونے کے طور پر موجود تھا اور ان سب کی رہنما" اجمل خاں کی ذات ہوگی۔ جب بہت سے لوگ قوم میں "بیداری" اور حرکت پیدا کرنے والے، قوم کے خواب غفلت سے فائدہ اٹھا کر اپنی جیبیں بھر کر اس دنیا سے گذر چکے ہوں گے اور دنیا جیسا کہ اس کا قاعدہ ہے، مصلحوں کو بھول چکی ہوگی تو اجمل خاں کے نام لیواؤں میں ایسی جماعت ملے گی جو مسلمانوں میں گھر گھر تعلیم کی روشنی پھیلائے گی، جب مسلمانوں کو ان کی تعدادی نسبت کے مطابق ملازمتیں دلوانے والے خود کسی بڑی کرسی پر پہنچ کر اپنی اس جدوجہد کو بھول جائیں گے تو حکیم اجمل خاں کو یاد کرنے والے ہی اس بد نصیب قوم کو الکاسب حبیب اللہ کی بھولی ہوئی بشارت یاد دلا کر ان کی معاشی حالت کو درست کرنے میں ساعی نظر آئیں گے۔

کیوں؟ اس لئے کہ اجمل خاں کی تحصیل، جس قدر وسیع تھی "تعمیر وتخلیق" کا جذبہ بھی اتنا ہی ہمہ گیر تھا وہ رہی نہیں کہ اس کی تعمیری جدوجہد محض خیالات کی دنیا میں رہی ہے، اس نے اپنے کاموں کا پورا نقشہ خارج کے لئے بنا دیا ہے۔ سب کاموں کی بنیادیں وہ خود اپنے ہاتھ سے رکھ گیا ہے اور اس کا بھی انتظام کر گیا ہے کہ نئے معمار کمزور ہاتھوں سے ہی سہی، رک رک کر اور آہستہ آہستہ ہی سہی لیکن ان بنیادوں پر وہ عمارت ضرور کھڑی کردیں گے جو اس معمار قومی کی نظروں میں ہر وقت رہتی تھی۔ اس لئے کہ وہ اپنی زندگی کے نمونے سے، اپنی محبت سے، اپنی نظر کے فیض سے ان معماروں کے دل میں یقین وایمان کا سرمایہ چھوڑ گیا ہے۔

جو لوگ مرحوم سے اپنے کسی جسمانی مرض کے لئے نسخہ لینا چاہتے تھے، جو کسی ملازمت کے لئے سفارش کے خواہاں تھے، جنھیں کسی عزیز کی شادی کے لئے روپیہ درکار تھا، جس بیوہ کی روٹی مرحوم کی پوشیدہ توجہ سے چلتی تھی، جس یتیم کی تعلیم کے لئے اس کے خزانہ سے روپیہ آتا تھا، اور ان کی تعداد سینکڑوں ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ہے، تو افسوس ہزار افسوس کہ ان سے اجمل خاں ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے! لیکن طب قدیم کا مجدد اور مسیحا، معاشرتی اصلاحی و مذہبی رواداری کا علم بردار، قومی تعلیم کا رہنما اجمل خاں زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہ اجمل خاں جو ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا اتنا بڑا تھا کہ زمانہ اب مشکل سے اس کی مثال پیدا کر سکے گا لیکن جو اجمل خاں زندہ ہے وہ اس سے بھی کہیں بڑا ہے اور آج لوگ اس کی بڑائی کا اندازہ بھی مشکل سے کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر انصاری

کل رات کو کوئی ڈیڑھ بجے ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر مختار احمد انصاری دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ابھی پرسوں کسی کام سے مسوری تشریف لے گئے تھے۔ وہاں سے واپس آرہے تھے کہ راستے میں دل کی حرکت بند ہو گئی، اور یہ بے شمار کاموں اور اور ان گنت قدر دانوں کو، اس دیس کو جس کی خدمت میں ساری عمر گذار کر اُن کا بڑا ہی سُنا، ان ہندو مسلمانوں کو جن میں میل ملاپ اور محبت پیدا کرنے کے لئے خون پسینہ ایک کیا، اُن مریضوں کو جن کی آخری امیدوں کا سہارا اُن کا مطب تھا، اس جامعہ ملیہ کو جس کے بچوں کو دیکھ کر اُن کا خون چلوؤں بڑھتا تھا اور جن سے انھیں یہ امید تھی کہ اُن کی زندگی میں وہ آرزوئیں پوری ہو سکیں گی جو اس وقت ارمان ہی ارمان ہیں۔ ہاں گھر بار کو، بال بچّوں کو، عزیزوں کو، دوستوں کو، سب کو چھوڑ کر نہ جانے کیا جی میں آئی کہ آدھی رات گئے اس راہ پر چل پڑے جس پر چلنے والے پھر منہ موڑ کر نہیں دیکھتے۔ اُن کی زندگی کا چراغ گل ہونے سے

ایک ان کے اپنے گھر میں اندھیرا نہیں ہوا، اس دیس کے ہر بچے کے دل میں اس غم کی اندھیاری چھائی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ذات فیض کا ایک چشمہ تھی اور یہ اپنے پرائے سب کے لئے بہتا تھا۔ اُن کی شخصیت ایک سہارا تھی جو وقت پڑے سب کے کام آتا تھا۔ اُن کا دل ایک ٹھکانا تھا جہاں ہر دکھی دل کو پناہ ملتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے جس دن سے دنیا کے میدان عمل میں قدم رکھا ان کی شخصیت نے سب کا من موہ لیا۔ اس لئے کہ وہ نیک تھے، سچے تھے مخلص تھے، فیاض تھے، ساتھیوں کی خوشی کو اپنی خوشی اور اُن کے غم کو اپنا غم جانتے تھے۔ اس سے پہلے کہ ان کی سیاسی خدمات انھیں مشہور کریں، ہزاروں آدمی انہیں اپنا سمجھنے لگے تھے۔ ان کی سوجھ بوجھ، تدبیر، خلوص اور ایثار نے بہتروں کو اُن کا گرویدہ بنایا لیکن ان کی محبت اور ہمدردی نے کہیں زیادہ لوگوں پر اپنا جادو کیا۔ اس وقت ان سب کی نظروں میں ان کی پریم بھری آنکھیں، اُن کا مسکراتا ہوا چہرہ پھر رہا ہوگا اور ان کی محبت کی یاد سے دل میں رہ رہ کر درد اٹھتا ہوگا۔ پھر سوچئے کہ اس سانحہ سے ان لوگوں کے دلوں پر کیسی چوٹ لگی ہوگی جو ڈاکٹر صاحب کے خاندان یا جامعہ ملیہ کے بچوں اور استادوں کی طرح خاص ان کے سائے میں رہتے تھے۔ موت کی گھڑیاں سب کے لئے آتی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب تو ابھی چھپن سال کے تھے۔ اُن کے لئے تو وہ زمانہ آرہا تھا کہ اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے پودوں کو پھلتے پھولتے دیکھتے اور جب وہ نہ مٹنے والی گھڑی آتی تو انھیں کچھ وصیت کرکے اطمینان سے آنکھیں موند لیتے۔ پر یہ سب خدا کو منظور نہ تھا اور ہوتا تو وہی ہے جو اسے منظور ہے۔ وہ اکیلے چل دیئے اور ہمیں اکیلا چھوڑ گئے۔

ڈاکٹر صاحب کی ساری زندگی میں سچ پوچھئے تو ان کے خاندان کی روایتوں کا رنگ جھلکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے وطن یوسف پور کے انصار حضرت ایوب انصاری کی اولاد ہیں، جن کے گھر مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے والے قافلہ نے جاکر قیام فرمایا تھا، اس وقت جب مخالف اس کی حق کی پکار کو اپنے شور سے دبا دینا اور اس کی تعلیم کے چراغ کو اپنی پھونکوں سے بجھا دینا چاہتے تھے۔ پر جس

کی للکار سے سوتی دنیا چونک اٹھی اور دکھیا انسانیت نے بڑی ہی راحت پائی۔ اسی وقت سے سچائی کی مدد، مہمان نوازی، فیاضی اس خاندان کا حصہ رہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے تو ان کے خاندان کا ستارہ ذرا گردش میں تھا۔ لیکن بچپن ہی سے اُن کی طبیعت میں بلندی کے آثار نمایاں تھے ۱۸۹۶ء میں جب انھوں نے اپنے وطن کا مڈل اسکول چھوڑا اس وقت تک جب وہ انگلستان میں تعلیم سے فراغت پاکر ہندوستان واپس آئے، یہ اپنی محنت اور ذہانت سے ہمیشہ تعلیمی وظیفہ حاصل کرتے رہے اور ان وظیفوں سے اکثر چھپ چھپ کر اپنے کسی عزیز کو تعلیم دلاتے رہے۔ کامیابی کے ساتھ ساتھ ان کا یہ مبارک شوق بھی بڑھتا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں جب انھوں نے دہلی میں فتح پوری پر اپنا مطب کھولا تو ان کی غیر معمولی لیاقت کے ساتھ ان کی مہمان نوازی اور دریا دلی بھی بہت مشہور ہوئی ۱۹۱۲ء میں انھوں نے ٹرکش میڈیکل مشن کی رہبری کے لئے اپنی پریکٹس چھوڑ دی۔ گھر میں جو کچھ بک سکتا تھا بیچ ڈالا اور زخمی ترکوں کی مرہم پٹی کرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ وہاں سے واپس ہوئے تو خالی ہاتھ۔ پھر پریکٹس شروع کی۔ ذرا اطمینان ہو چلا تھا کہ خلافت کی تحریک شروع ہوئی اور ڈاکٹر صاحب نے پھر اپنا وقت اور پیسہ قوم پر نثار کر ڈالا۔ ۱۹۲۰ء میں جب وہ خلافت کے ڈیپوٹیشن لے کر انگلستان گئے تو اپنا موٹر بیچ کر۔ جب واپس آئے تو ملک میں ایک تہلکہ تھا۔ اس وقت کوئی خدمت ایسی نہ تھی جسے انجام دینے میں ڈاکٹر صاحب مرحوم جھجکے ہوں۔ وہ کون سودا تھا جو اس سر میں نہ تھا۔ نہ دن چین سے گذرتے تھے اور نہ راتیں۔ ان کا حوصلہ تھا کہ بڑھائے جاتا تھا اور ہمت تھی کہ مہمیز لگائے جاتی تھی۔

۱۹۲۲ء کے بعد ملک میں کچھ سکون سا تھا۔ پر اس سکون میں وہ اور بھی بے چین تھے کیونکہ ہندو مسلمانوں میں میل جسے وہ جان سے عزیز رکھتے تھے اس وقت فنا ہوتا نظر آتا تھا اور وطن کے دونوں بیٹوں میں پریم و محبت کا رشتہ قائم کرنے کی خاطر کم لوگ ہیں جنھوں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی طرح اپنی عزت، شہرت، اپنے سکھ، اپنے چین کو داؤں پر لگایا ہو۔ اس پاک کوشش میں انھیں جو دُکھ پہنچے ان کا ذکر اس وقت کیا کروں، انھوں نے اس

پاک طینت، نیک نفس انسان کا دل چھلنی کر دیا تھا۔ آج جب وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا، ہمیں سب کو، ہندو مسلمانوں کو اس پاک کوشش میں اس کی ناکامی پر شرم سے سر اٹھانے کا موقعہ نہیں ہے۔ اور اس شرم کو آنسوؤں کی دو بوندیں نہیں دھو سکتیں اس کے لیے ساری عمر اسی کام میں سر کا پسینہ ایڑیوں تک بہانا ہوگا۔ جب بھی شاید نہ دھلے گی۔ اسی کام کی خاطر، ہاں جاننے والے جانتے ہیں کہ اسی کام کی خاطر انھوں نے اپنی تمام پریشانیوں اور دشواریوں کو بھلا کر، کانگریس کی صدارت ۱۹۲۷ء میں منظور کر لی۔ اسی کی خاطر جامعہ ملیہ کے کمزور پودے کی آبیاری اپنے ذمے لی اس لیے کہ ملک کا رنگ اور ملک والوں کے ڈھنگ دیکھ کر اُن کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ نئے ہندوستان کے لیے نئے آدمیوں کی ضرورت ہے، ایسے آدمیوں کی جو اپنی اچھی چیزوں پر بھروسہ رکھیں، انھیں برتیں، انھیں ترقی دیں، تاکہ

دوسروں کی اچھی باتوں کو سمجھیں اور ان کی عزت کریں، خود مضبوط ہوں اور دوسروں کی مضبوطی سے ڈریں نہیں، مانگیں ہی نہیں، دینے کو کچھ رکھتے ہوں اور دینے کی کچھ ہمت بھی رکھتے ہوں۔ مسلمانوں میں ایسے آدمی پیدا کرنے کے لیے انھوں نے اپنی امیدیں اس تعلیم گاہ سے باندھی تھیں اور اس کی ترقی کو وہ ملک کی سب سے بڑی خدمت سمجھتے تھے۔ آج سہ پہر کے وقت جامعہ ملیہ والوں نے اپنے سرپرست کو اپنی نئی بستی کے پہلو میں جا کر دفنایا ہے، خدا انھیں توفیق دے کہ وہ اس آرزو کو بھی پورا کر سکیں جو ڈاکٹر صاحب کا دکھا ہوا زخمی دل اپنے ساتھ لے گیا۔ اب اس مدرسے کے بچوں کے سر پر ڈاکٹر کا ہاتھ نہ پھرے گا۔ اس کام کے کرنے والوں سے کوئی آ کر شرما شرما کر یہ نہ کہے گا کہ میں تمہارے لیے کچھ کام نہ کر سکا، تم سے آنکھیں ملانے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ وہ اپنے لڑکپن میں اب کس سے روٹھیں گے اور کون انھیں آ کر منائے گا۔ ہاں کوئی نہیں پر اس دکھی دل کا دکھ ہمیں یاد رہے گا اور ہم میں کچھ ہے تو ہم سے کرائے گا بھی۔ ہمارا کام بڑھے گا، پھیلے گا، ہمیں ہزاروں دولتیں ملیں گی، پر ڈاکٹر انصاری کا سا دل نہ ملے گا۔

حسرت موہانی

حسرت بڑی مستقل طبیعت کے آدمی تھے۔ جس بات کو صحیح جانتے تو اس کی پیروی میں اور دوسروں تک اسے پہنچانے میں نہ کسی شخص سے ڈرتے تھے نہ کسی چیز سے، شاید خود اپنے سے بھی نہیں!

نفس کے مطالبات کے پیچھے لوگ کیا کچھ نہیں کر ڈالتے ہیں، حسرت نے ضمیر کے مطالبات کی خاطر سب کچھ کر ڈالا۔ تمام عمر مصیبت جھیلی لیکن کوئی مصیبت ان کے ضمیر کی آواز کو نہ دبا سکی، ہر مصیبت نے ان کی شان دوبالا کی۔

وہ کتنے پکے مسلمان تھے، کتنے بہادر ہندوستانی، کتنے سچے آدمی اور کیسے اچھے شاعر، شیریں و شائستہ !

ہند اور کشمیر کا ناتا

اپنی بدکرداریوں، غفلتوں، تن آسانیوں اور بد دیانتیوں سے، جب آزادی کی دولت ہماری قوم نے کھو دی، اور ہمارا عزیز دیس غلامی کی مصیبت میں گرفتار ہوا تو اس ذلت کی تلخی ہم دونوں نے، ہندوستان اور کشمیر نے، ایک سی چکھی۔ شمع آزادی کے گل ہونے کے بعد کیسی کالی رات تھی وہ غلامی کی رات، اور کیسی لمبی رات تھی وہ! اخلاقی پستیوں کی کیسی گھٹا جھکی ہوئی تھی، سر دل پر اس رات میں! وطن فروشی کے عفریتوں، خود غرضی کے جھینگروں سے کیسی بھری ہوئی تھی وہ گھٹا ٹوپ رات! جھوٹ، فریب، نفاق کی کیسی زہریلی ہوائیں پھیلی ہوئی تھیں اس رات میں! اُف رے وہ رات!!

مگر آدم کی اولاد پر راتیں بھی آئی ہیں اور وہ اُسے جیسے تیسے سحر کرتی ہے۔ لیکن اس رات کی سحر اپنے آپ نہیں آتی؛ اس کے سونے والوں کو سورج آ کر خود نہیں جگاتا، جاگ جاگ کر اسے سحر کرنا ہوتا ہے۔ بہت تو سوتے رہیں، پر کچھ جاگتے [illegible]

رہتے ہیں؛ اور ان کو اپنے دل کے ٹمٹماتے چراغوں سے اس کی اندھیاری میں روشنی کی لَو کو طوفان سے بچانے کے لیے جان جوکھوں میں ڈال کر جتن کرتے ہوتے ہیں۔

ہندوستان کے سپوتوں نے اپنے دیس کی اس رات کو اپنا تن من دھن سب کچھ تج کر سحر کیا، تو کشمیر والوں نے بھی اس میں کسر نہیں اٹھا رکھی؛ بلکہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں جو کام کانگریس نے کیا، اور سچ تو یہ ہے کہ سب کچھ اس نے کیا، اس میں بھی کشمیر کا حصہ حصۂ رسدی سے زیادہ ہی ہے .... ایک کشمیری ہی آج ہندوستان کا وزیر اعظم ہے: دیس میں سب کی آنکھوں کا تارا، ایک نئی جمہوریت میں سچی اور اچھی بات کا سہارا، سچ کی کڑواہٹوں سے نہ گھبرانے والا، مصیبت اور بپتا میں سب کے کام آنے والا! وہ جس کی بے لاگ صفائی، جس کی بے باک سچائی، اچھائیوں کے لئے جس کی بے صبری، برائیوں سے جس کی بیزاری، جس کی دیانت جس کی دلیری، ہمارے دیس کا قیمتی سرمایہ ہے!

(۳)

بدنصیب وطن کی پکار

عزیزو! تم علم کے اس شہر کاشی سے یہاں کے اس مشہور ودیا پیٹھ میں اچھے اچھے اور لائق استادوں سے تعلیم پاکر اب دنیا میں قدم رکھتے ہو۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس دنیا میں جو ودیا پیٹھ سے بہت سخت اور بے رحم جگہ ہے تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ ہوسکتا ہے کہ تمہارا حوصلہ ہو کہ تجارت اور کاروبار، بیوپار یا نوکری سے بہت سا دھن دولت کماؤ اور چین سے اپنی اور اپنے خاندان کی زندگی گزارنے کا سامان کرو۔ اگر ایسا ہے تو خدا تمہارے ارادوں میں برکت دے۔ مگر مجھے تم سے پھر کچھ بہت کہنا نہیں ہے۔ تم اپنی کامیابی کے لئے راہیں تلاش کر لوگے۔ اگر ٹھیک راستے پر پڑے تو اپنا فائدہ کروگے، اگر غلط پر پڑے تو سزا بھگتوگے، مگر دوسروں کا کچھ بہت نقصان نہ ہوگا۔ لیکن چاہے تم دھن دولت کی فکر ہی میں لگ جاؤ، کم سے کم کاشی ودیا پیٹھ کے نائک ہو کر تم کبھی اپنی قوم کی راہ میں روک نہ بننا۔ اپنی کامیابی کے لئے بہتیرے لوگ قوم کا نقصان کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ تم اس کا دھیان رکھنا کہ کامیابی کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اپنے فرائض

کو ترک کر کے اور اپنی ساری اچھی خواہشوں کو پیروں تلے روند کر ہی اس تک پہنچا جائے۔ جو اپنی غرض کے لئے اندھا ہو جائے کہ اپنے دیس اور قوم کو نقصان پہنچانے سے بھی نہ چوکے، وہ آدمی نہیں جانور ہے۔

اور اگر کاشی ودیا پیٹھ میں پڑھے ہونے کی وجہ سے تم اپنی زندگی دیس کی سیوا میں لگانا چاہتے ہو، تو مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔

تم جس دیس میں یہاں سے نکل کر جا رہے ہو۔ وہ بڑا بدنصیب ملک ہے۔ وہ غلاموں کا ملک ہے۔ جاہلوں کا ملک ہے، بے انصافیوں کا ملک ہے، بے رحموں کا ملک ہے، ظالمانہ رسموں کا ملک ہے، غافل پجاریوں کا ملک ہے، بھائی بھائی میں نفرت کا ملک ہے، بیماریوں کا ملک ہے، سستی موت کا ملک ہے، غرض بڑا کم بخت ملک ہے۔ لیکن کیا کیجئے تمہارا اور ہمارا ملک ہے۔ اسی میں جینا ہے اور اسی میں مرنا ہے۔ اس لئے یہ ملک تمہاری ہمتوں کا امتحان، تمہاری قوتوں کے استعمال اور تمہاری محبت کی آزمائش کی جگہ ہے....

ہمارا مستقبل کسان کی ٹوٹی جھونپڑی، کاریگر کی دھوئیں سے کالی چھت اور دیہاتی مدرسے کے پھونس کے چھپر تلے بن اور بگڑ سکتا ہے۔ سیاسی جھگڑوں کانفرنسوں اور کانگریسوں میں کل اور پرسوں کے قضیوں کا فیصلہ ہو سکتا ہے، لیکن جن جگہوں کا نام میں نے لیا ہے ان میں صدیوں تک کے لئے ہماری قسمت کا فیصلہ ہوگا اور ان جگہوں کا کام صبر چاہتا ہے اور استقلال۔ اس میں تھکن بھی زیادہ ہے اور قدر بھی کم ہوتی ہے۔ جلدی نتیجہ بھی نہیں نکلتا۔ ہاں کوئی دیر تک صبر کر سکے تو ضرور پھل میٹھا ملتا ہے۔

.... سیوا کے اس راستہ میں جس کا ذکر کر رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ بڑی

دشواریاں ہیں، اس لئے ایسے وقت بھی آئیں گے کہ تم تھک کر شل ہو جاؤ گے، بے دم سے ہو جاؤ گے اور تمہارے دل میں یہ شبہ بھی پیدا ہونے لگے گا کہ یہ جو کچھ کیا سب بے کار تو نہ تھا۔ اس وقت مادّی اور امکانی طور پر آزاد بھارت ماتا کی اس تصویر کی طرف ہمیشہ دھیان لگانا جو تمہارے دل میں ہمیشہ رہنی چاہیئے۔ یعنی اس دیس کی تصویر جس میں سچّائی کی حکومت ہو گی، جس میں سب کے ساتھ انصاف ہو گا، جہاں امیر غریب کا فرق نہ ہو گا بلکہ سب کو اپنی اپنی صلاحیتوں کو پوری پوری ترقی دینے کا موقعہ ملے گا، جس میں لوگ ایک دوسرے پر بھروسہ کریں گے اور ایک دوسرے کی مدد، جس میں مذہب اس کام میں نہ لایا جائے گا کہ جھوٹی باتیں منوائے اور خود غرضیوں کی آڑ بنے، بلکہ زندگی کو سُدھارنے اور اُس کو بامعنی بنانے کا ذریعہ ہو گا۔ اس تصویر پر نظر ڈالو گے تو تمہاری تھکن دور ہو جائے گی اور تم نئے سرے سے اپنے کام پر لگ جاؤ گے۔ پھر اگر چاروں طرف کمینہ پن اور خود غرضی، مکّاری اور حیلہ بازی، غلامی اور غلامی پر رضامندی پاؤ تو سمجھنا کہ ابھی کام ختم نہیں ہوا ہے، مورچہ سر نہیں ہوا، اس لئے جنگ جاری رکھنی چاہیئے۔ اور جب وہ وقت آئے جو سب کو آتا ہے، اور اس میدان کو چھوڑنا پڑے، تو یہ تسلّی تمہارے لئے بس ہو گی کہ تم نے اپنے بس بھر اپنے سماج کو آزاد کرانے اور اچھا بنانے میں کوشش کی جس نے تمہیں آدمی بنایا تھا۔ تم چلے جاؤ گے دوسرے تمہارے کام کو جاری رکھیں گے۔ اس لئے کہ یہ کام کبھی ختم ہونے والا کام نہیں۔ سماج کی آزادی اور سماج کی صحت ایسی چیزیں نہیں جو بس ایک دفعہ حاصل کر لی جائیں۔ یہ اسی سماج کو ملتی ہیں اور اسی کے پاس رہتی ہیں جس کے سپوت اُنہیں روزانہ نئے سرے سے حاصل کر سکیں۔

نئے آدم کی تلاش

جب ذات پات، مذہب، زبانوں کے فرق سے ہمارا دیس ٹکڑے ٹکڑے نظر آتا ہے، جس ملک میں اسٹیشنوں پر مسلمان پانی اور ہندو دودھ ملتا ہے، جس دیس میں مختلف قسم کی نسلیں بستی ہیں، جہاں بالکل مختلف انداز کے تمدن ساتھ ساتھ رائج ہیں، جہاں ایک کا سچ دوسرے کا جھوٹ ہے، جہاں بت پرست اور بت شکن کو قدرت نے ساتھ ساتھ دُکھ سُکھ کے لئے ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کے لئے یکجا کر رکھا ہے، اس ملک میں نوجوانوں سے ایسے مِل کر کام کرنے کی آس ذرا مشکل ہے، مگر دل گواہی دیتا ہے کہ تھوڑے دن اور دھکے کھانے کے بعد اِس ملک کے نوجوان دیس کی سیوا کے لئے یکدل ہو جائیں گے۔ اِس لئے میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کی قسمت میں قدرت نے یہ بات رکھی ہے کہ یہاں مختلف قسم کے انسانی نمونے ایک دوسرے سے مل کر ایک ایسا آدم تیار کریں جو تہذیب اور تمدن کی ایک نئی تشکیل کر سکے۔ قدرت کے اس تجربہ اور قدرت کے اِس ارادے میں مدد کرنا تمہارا کام ہے!!

کاش!

یوں تو آدمی آنکھوں پر ٹھکریاں رکھ لے تو کوئی اُس کا کیا کر سکتا ہے۔ پر آپ کے چاروں طرف جو دُکھ اور بیماری پھیلی ہوئی ہے، افلاس اور فاقے نے جو صحت کا حال کر رکھا ہے، جہل نے جس طرح اس بری حالت کو اور بدتر بنا دیا ہے، اُس کا احساس آپ کو ہوگا تو چین کی نیند نہ سو سکیں گے۔ زندگی کی بپتا، دکھ اور بیماریاں ہم سے اتنی قریب ہیں کہ اکثر ہم ان سے غافل ہو جاتے ہیں، آہیں اتنے سینوں سے نکلتی ہیں کہ ساری فضا ان سے بھر جاتی ہے،

اور ہم انھیں سن نہیں سکتے، اور شاید یہ اپنی زندگی گزارنے کے لئے ٹھیک ہی ہو۔ اس لئے کہ اگر احساس قوی ہو، ہر آہ سنائی دے اور ہر دُکھ دکھائی دے، تو ایسا ہو جائے جیسے کوئی گھاس کے اُگنے اور بڑھنے کی آہٹ سننے لگے، اور ہر جاندار کے دل کی دھڑکن محسوس کرنے لگے۔ اور شاید ہم اس ہیبت ناک شور کی تاب نہ لا سکیں جو بیتا کے اس سناٹے میں چھپا ہوا ہے۔ مگر یہ سنائی دے کر چاہے ہمارے کانوں کے پردے نہ پھاڑے اور دکھائی دے کر ہماری آنکھوں کو رلا رلا کر بے نور نہ کرے مگر اس کے وجود کا علم ہمیں ہے اور اس سے بھاگنا ممکن نہیں۔ میری التجا آپ سے یہ ہے کہ اس دکھ کے دور کرنے کے لئے آپ کمر باندھیں، ہمت سے سب کام ہو جاتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ایک اچھی زندگی کا اُسوۂ حسنہ ہزاروں لاکھوں نہیں کروڑوں انسانوں کے لئے رحمت بن جاتا ہے۔ ایک گندہ خیال، ایک فاسد مگر دلفریب زندگی، مدتوں تک زندگی کے چشموں کو مسموم کر سکتا ہے (ایک خود غرضی، ایک ہٹ، ایک کوتاہ اندیشی بسا اوقات قوموں کی قوموں کے لئے زندگی کو عذاب بنا سکتی ہے) جس زندگی کا توازن اتنا نازک ہو اس کے مطالبوں سے جامد ذہن عہدہ برآ نہیں ہو سکتے ۔ ۔ ۔ ۔

میرا پیام آپ کو یہی ہے کہ اپنی سیرت کی تربیت کو اپنے ہاتھ میں لیجئے، ضبطِ نفس اور بے غرض خدمت سے اس کے عناصر کی پرورش کیجئے، اچھی سیرت بنائیے اور اسے اقدار عالیہ مطلقہ کا خادم بنا کر شخصیت اخلاقی یعنی بندۂ مومن اور مردِ مجاہد کے مرتبۂ بلند پر پہنچا دیجئے۔ کام بڑا دشوار ہے اور عمر بھر کا کام ہے، مگر اسی کام کے کرنے کے لئے ہی تو زندگی عطا ہوئی ہے یہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے

بیٹھے رہنے سے کیسے انجام پائے گا اس میں تو زندگی ہی کھپانی چاہئے۔

شخصیت کی تعمیر

ہر انسان میں حیوان اور انسان دونوں ہوتے ہیں۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے اندر کا حیوان دب جائے۔ اپنی بہیمیت کو دبانا اور اپنی انسانیت کو ترقی دینا، یہی تعلیم کا سب سے بڑا راز ہے۔ جو لوگ اس درسگاہ میں اس غرض سے آتے ہیں کہ وہ یہاں امتحان پاس کریں گے، اور انھیں کوئی ڈگری مل جائے گی۔ ان کا ارادہ اور معیار پست ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان کو روزی یا ملازمت مل جائیگی یہ غلط تو نہیں ہے لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے۔ تربیت ذہنی اور تربیت روح، یہ سب سے بڑا کام ہے، عمر بھر کا کام ہے۔ یہ اسی وقت سے شروع ہو جاتا ہے جب سے ہم ہوش سنبھالتے ہیں۔ تعلیم گاہ کا مقصد یہ ہے کہ اس راہ میں آپ کے قدم صحیح پڑ جائیں۔ آپ یہاں اپنی تربیت کے لئے آئے ہیں۔ انسان اور جانور میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جانوروں پر کسی قسم کی سماجی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ ایک انسان ہی ہے جس کے نصیب میں متضاد عناصر کی کشاکش میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے، اپنا توازن کھو بھی سکتا ہے، پا بھی سکتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انسان شاید ایک درمیانی عبوری مخلوق ہے۔ اس کے وجود کی سرحدیں ایک طرف حیوانی علاقہ سے ملتی ہیں، ایک طرف الٰہی سے۔ اس کا واسطہ مادی اشیاء کی دلفریب کشش سے بھی ہے اور مادیت سے دامن چھڑانے کا شدید ولولہ بھی اس میں کارفرما ہے۔ یہ خود غرضی و خود بینی کا مرکز بھی ہے اور محبت کی بے غرضی اور بے نفسی سے بھی اس کا سینہ معمور ہے۔ یہ سفاکانہ تاخت و تاز کے بے خیال

اور بر خود غلط جنون کا شکار بھی ہو سکتا ہے اور بے نفلے کٹھن سے کٹھن اجتماعی کام
کی تعمیر کیلئے اپنی قوت کا ایک ایک شمہ بھی وقف کر سکتا ہے۔ یہی حریصوں کی طرح
بٹورتا ہے، یہی بہار کی طرح لٹاتا ہے، یہی ہر تغیر سے ڈرتا ہے اور سارے تغیر
اس کے شرمندۂ احسان ہیں، یہی احتیاط کے مارے پھونک پھونک کر قدم اٹھانے
سے بھی ڈرتا ہے اور کبھی یہی سرفروشانہ دہکتی آگ میں کود پڑتا ہے۔ یہی زمین سے
بچھ نہیں ہٹا سکتا، یہی ستاروں سے باتیں کرتا ہے، یہی زندگی پر جان دیتا ہے اور
حیات بے شرف تک پر راضی ہو جاتا ہے۔ یہی جان دیکر زندگی کا چراغ روشن کرنا
بھی جانتا ہے اور مرگ با شرف کو اصل حیات اور ضامن حیات مانتا ہے؛ یہی سرکشی
کرتا ہے یہی سر تسلیم خم کرتا ہے، یہی کافر ہے یہی مومن، یہی فرعون ہے یہی موسیٰ
یہی شرار بولہبی، یہی چراغ مصطفوی، یہی یزید یہی شبیر ـــــ اور اس کے ارتقاء
کا سارا راز بہائم پر اس کی فضیلت ہے۔

اگر آپ اس غرض سے تعلیم حاصل کر رہے ہیں کہ آپ کو بعض واقعات یاد
ہو جائیں، تو یہ ٹھیک نہیں (جب تک علم حاصل کرنے والے پر کیفیت طاری نہ ہو
جب تک وہ اس کی جستجو میں نہ گھلے۔ جب تک وہ اس کے لیے تکلیفیں نہ جھیلے،
اس کا علم خام ہے)۔ تاریخ کے تمام واقعات یاد کر کے ہم مورخ نہیں بن سکتے؛
اگر مورخ ہو بھی گئے تو انسان نہیں ہو سکتے۔ اگر آپ تمام دنیا کے شعر یاد کرلیں تو
آپ شاعری سے مستفید نہیں ہو سکتے جب تک آپ پر کیفیت طاری نہ ہو۔ انسان
اپنی تربیت بہترین اقدار کو اپنا کر ہی کر سکتا ہے، ہمارے رسوم، زبان، ادب اور
مذہب یہ سب امتحانی اقدار کی نشانیاں ہیں۔ جو ان کو اپنا لیتا ہے، اپنے اندر
رچا بسا لیتا ہے وہ کامیاب ہے۔ کبھی آپ کا جی چاہتا ہے کہ ان مسائل کی
کھوج میں پڑ جائیں جو ابھی حل نہ ہوئے ہوں؟ کبھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ شعر
پڑھکر خود بھی شعر کی تخلیق کے لیئے لگن پیدا ہو؟ کبھی سائنس کا تجربہ کرتے وقت آپ
کے دل میں یہ اُمنگ پیدا ہوتی ہے کہ آپ بھی کسی حقیقت کو دریافت کریں۔؟

تعلیم کا مقصد یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو روزی کمانے کے قابل بنا سکے
سوسائٹی میں روزی کمانے والا خود غرض نہیں۔ ہم جس سوسائٹی میں رہتے ہیں اس میں
ہمیں باعزت زندگی گزارنا چاہیے ہم سوسائٹی کو آگے بڑھانا چاہیے۔ جو آدمی
اپنی سوسائٹی کو اسی حالت میں چھوڑ دیتا ہے وہ اس کا خائن ہے۔ ہر اچھا آدمی

مرنے سے پہلے سوسائٹی کو اس سے بہتر حالت میں چھوڑتا ہے۔ جو لوگ تعلیم حاصل کرنے آئے ہیں وہ بہت بڑا کام شروع کر چکے ہیں۔ انھیں پہلے اپنے آپ کو سمجھنا ہے، اپنی صلاحیت کا جائزہ لینا ہے اور اپنی انفرادیت کا پتہ لگانا ہے بہت سے لوگوں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ ان کے اندر کیا صلاحیت ہے، انھیں کیا کرنا ہے، انھیں اپنے لئے کون سی راہ منتخب کرنی ہے۔ اپنی صلاحیت اور اپنی انفرادیت کو پالینا، اور اس کے مختلف عناصر میں یک جہتی پیدا کر لینا ہی کیریکٹر ہے۔ جب آدمی اپنے کیریکٹر کو کسی بڑے مقصد کیلئے وقف کر دے تو وہ شخصیت بن جاتی ہے اور اگر وہ شخصیت اعلیٰ اقدار کی سیوا میں لگ جاتی ہے تو اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ بن جاتا ہے، اس کی زبان خدا کی زبان بن جاتی ہے کیونکہ اعلیٰ اقدار خدا ہی کا نام ہے۔ شخصیت دنیا میں سب سے بڑا شاہکار ہے۔ ہم ادنیٰ سے ادنیٰ اور کمزور سے کمزور لوگ بھی اعلیٰ اقدار کی سیوا کر کے بڑے بن سکتے ہیں۔ شخصیت کی تعمیر جماعت ہی میں رہ کر ہو سکتی ہے۔ مسلسل اور پیہم تنہائی میں شخصیت نہیں بن سکتی۔ انسانوں میں رہ کر انسانوں کا کام کر کے شخصیت بن سکتی ہے۔ آپ دوسروں سے بھلائی کریں گے تو جماعت بہتر بنے گی۔ اور آپ کی شخصیت بھی بنے گی۔ سماج کی بھلائی میں اپنی بھلائی ڈھونڈیئے۔ چھوٹی چھوٹی بداخلاقیوں سے پوری جماعت کا وقار خراب ہوتا ہے۔ جماعت کی عزت اور ذلت ہم خود ہیں۔ محض چند لوگوں کی بداخلاقیوں سے پوری جماعت بدنام ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ چند لوگوں کی وجہ سے سب لوگ برے نہیں ہو جاتے لیکن وہ چند برے لوگ بھی ہیں ہم سے ہیں۔ ہمارا ہی گوشت اور خون ہیں۔ ان کی ذمہ داری بھی ہمیں پر ہے۔ اپنے ادارہ اور اپنی جماعت کو بہتر بنائیے۔ آپ کے ادارہ کی خوبیوں سے آپ میں خوبیاں پیدا ہوں گی۔ آپ میں خوبیاں پیدا ہوں گی تو آنے والی نسلوں کو ایک بہتر سوسائٹی ملے گی۔

پڑھنا سب سے کم درجہ کا انسانی کام ہے۔ شرف انسانیت اصل مقصد ہے۔ اس مقصد کے لئے اپنے دل میں لگن پیدا کیجئے۔ دنیا کا ہر ذرہ جواب دینے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ کوئی سوال کرنے والا ہو۔ تمام دروازے کھلنے کے لئے بیتاب ہیں بشرطیکہ کوئی انھیں کھٹکھٹانے والا ہو۔

محبت، خدمت اور اقدار روحانی کی چاکری

جس دربار میں اس وقت حاضر ہوں اس کے آداب میں کم خوری اور کم خوابی کے ساتھ کم گوئی بھی ایک ادب ہے۔ یہاں عقیدت اور محبت کے مضامین رنگین نگاہ شوق یا چشم نم سے ادا ہوں تو اچھا ہوتا ہے لیکن صاحب سجادہ کا ارشاد ہے کہ کچھ کہو، اس لئے عقیدت کے دو پھول لفظوں کے روپ میں اس معلم و مرشد کی آرامگاہ پر چڑھاتا ہوں جس کے فیض تربیت کے اثرات آج بھی ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ملتے ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے فیوض و برکات سے یہ دیس چھ صدیوں سے مستفیض ہو رہا ہے اور آج بھی اس فیضان کا چشمہ جاری ہے۔ آج بھی بے گنتی انسانوں کے دل اس آستانہ کی طرف جھکتے اور اس سے تسکین اور تقویت اور راحت پاتے ہیں۔

محبت، خدمت اور اقدار روحانی کی چاکری کے جس پیغام کی اشاعت کا کام حضرت خواجہ اجمیریؒ نے سلسلۂ چشتیہ ہندیہ کے سپرد فرمایا تھا۔ وہ حضرت خواجہ بختیار کاکی اور شیخ فریدالدین شکر گنج کے ہاتھوں اور منظم ہو کر حضرت سلطان المشائخ شیخ نظام الدین محبوب الٰہی کے ہاتھوں اپنے درجۂ کمال تک پہنچا۔ آغاز کار کی دقتوں، کلفتوں اور صعوبتوں کا ذکر کیا کروں کہ شاید ایسے مقدس کام کی شرائط لازمی اور اس اہم ذمہ داری کے وسائل تربیت میں سے ہیں پھر اس وسعت اور کثرت فتوح کا کیا بیان کروں کہ گویا سونا برستا تھا اور ہزاروں آدمی اس درویش سلطان صفت کے لنگر سے روز کھانا کھاتے تھے۔ دلی کے تخت پر اچھے برے بادشاہ بھی آتے جاتے رہے مگر اس درویش خدا مست کی حکومت کا حلقہ دن بدن بڑھتا ہی گیا۔ اگر وہ حکمرانی جس کا سکہ جان و دل پر تھا۔ عسر میں استقامت اور یسر میں رضا جوئی الٰہی اور خلق اللہ پر شفقت تامہ کی ایسی مثالیں تاریخ میں کم ملتی ہیں۔

9/7/92

جو اثر اور قبول عام آپ کو قدرت نے بخشا وہ کم اور کسی کے حصہ میں آتا ہے تاریخ کی کتابوں میں پڑھیئے کہ امیر و غریب، عارف و عامی، بوڑھے جوان جاہل و عالم غرض ایک بے شمار مخلوق کا کیسا تانتا دہلی اور غیاثپور کے درمیان اس ذات گرامی کی وجہ سے بندھا رہتا تھا۔ کیسے سارے راستہ میں آنے والوں کی سہولت کے لئے لوگوں نے ہی کنویں کھدوا دیئے تھے۔ راستہ میں پینے کے ٹھنڈے پانی کا کیا کیا اہتمام رہتا تھا۔ سستانے اور عبادت کرنے کے لئے جگہ جگہ چبوترے بنا دیئے گئے تھے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مرد درویش نے کس طرح انسانوں کے دلوں کی بادشاہت پائی تھی۔

اس کا راز کیا تھا۔ اس کا راز ایک کھلا راز ہے۔ اپنی ذات کو کلیتہً اقدار عالیہ مطلقہ کا خادم بنا دینا۔ ان سے اس طرح وابستہ ہو جانا کہ قدر اور اس کے حامل کا فرق دشوار ہو جائے۔ نیکی، سچائی، اچھائی، عدل، محبت، شفقت، خدمت خلق کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لینا، یہی آپ نے کیا تھا۔ اصطلاح مذہب میں

اقدار عالیہ مطلقہ کے ان اسمائے حسنہ کے مجموعے کو خدا کہتے ہیں جو یہی آپ کی زندگی کا مقصود تھا وہی معبود۔ اور آپ نے اپنے شیخ کی زبان سے ایک خاص حالت وجد میں جو الفاظ سنے تھے۔

مقصودِ من خستہ ز کونین توئی
از بہرِ تو میرم ز برائے تو زیم

وہ عمر بھر کانوں میں گونجے اور سینے میں رمے رہے اور انھیں نے یہ حال کر دیا کہ

جاناں ما را دجان ما جاناں را

جو آدمی ان اقدار مطلقہ کا علَم بن جاتا ہے اس کے دل کی وسعتوں کا کیا پوچھنا۔ وہ ساری مخلوق کو خدا کا کنبہ جاننے ماننے لگتا ہے اور اسے خواجہ اجمیریؒ کے لفظوں میں قرب الٰہی حاصل کرنے کا موثر ذریعہ بس یہ نظر آنے لگتا ہے کہ

" درماندگاں را فریاد رسیدن وحاجت بے چارگاں روا کردن وگرسنگاں را سیر گردانیدن " درماندوں کی فریاد سننا، بے بسوں کی حاجت پوری کرنا، بھوکوں کا پیٹ بھرنا۔

خواجہ اجمیریؒ ہی نے ایک اور جگہ فرمایا ہے کہ خدا رسی کیلئے تین چیزیں درکار

ہیں ـ " اول سخاوتے چوں سخاوتِ دریا ـ دوم شفقتے چوں شفقتِ آفتاب ـ سوئم تواضع چوں تواضع زمین ـ " سخاوت دریا جیسی، شفقت آفتاب جیسی ـ مہمان نوازی زمین کی سی ـ " اور کون نہیں دیکھتا اور سمجھتا کہ دریا اپنی سخاوت میں، آفتاب اپنی شفقت میں اور زمین اپنی تواضع میں ذات پات مذہب و مشرب، نسل و زبان کی تفریقیں نہیں کرتے۔

خواجہ اجمیریؒ کے یہ مطالبے حضرت محبوب الٰہی کی زندگی میں پورے ہوتے نظر آتے ہیں۔

پھر کون نہیں جانتا اور کس نے نہیں دیکھا ہے کہ سخاوت شفقت اور تواضع کی صفتوں کے موجود ہوتے ہوئے بھی دین اور مذہب کا فرق لوگوں کے دلوں کو ایک دوسرے کی طرف سے بند کر دیتا ہے ـ مذہب جوڑنے کی جگہ توڑنے، ملانے کی جگہ جدا کرنے لگتا ہے ـ لیکن ان نفوس قدسی کا یہ حال نہیں؛ اور ہوتا بھی کیسے ـ حضرت نظام الدین اولیاء کی ذات گرامی میں جمالی شان کا مظہر اتم نظر آتا ہے، آپ کا دل انسانی ہمدردی سے لبریز تھا ـ آپ کی تعلیم و ارشاد کی خصوصیت توضیح روحانی قدروں کا تحفظ، ہمدردی اور انسان دوستی تھی ـ جب آپ نے ارشاد فرمایا:

" ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے " اور آپ کے دلدادہ عاشق اور چہیتے محبوب خسرو نے ان کی روح پاک پہ خدا کی رحمتیں ہوں فوراً دوسرا مصرعہ عرض کر دیا کہ ـ " ما قبلہ راست کردیم بر طرف کج کلاہے " تو یہ خالی مصرعہ لگانا نہ تھا بلکہ اس میں شاعر کے اس ایمان و یقین کا اعلان تھا کہ جو بات آپ نے فرمائی ہے جس رواداری کی طرف آپ کا تلقینی اشارہ ہے آپ کی ذات اقدس خود اس کا علم ہے اس لئے مرشد دلنواز کج کلاہ کی پیروی ہی اس قدر کی تکمیل کی ضامن ہے۔

پھر یہ بھی ایسا اوقات ہوتا ہے کہ آدمی وسیع القلب بھی ہے، مذہبی رواداری بھی رکھتا ہے، مگر جب کسی سے ذاتی پرخاش ہو جائے کوئی شخص بغض و عناد سے برسر پیکار ہو تو اس وقت شفقت کا دروازہ بند ہونے لگتا ہے اور قلب کی وسعت میں تنگی کی گنجائش نکلنے لگتی ہے ـ اس باب میں بھی حضرت محبوب الٰہی کا مسلک خاص طور سے قابل توجہ ہے ـ کسی مصرعہ موزوں کرنے والے کی نہیں، ایک صدق و خلوص مجسم کی دلی دعا ہے جس کے پورے وزن کو سمجھنا چاہیے ـ فرماتے ہیں:

ہر کہ مارا یار نبود ایزد او را یار باد
وانکہ مارا رنجہ دارد راحتش بسیار باد

ہر کہ او در راہِ ما خارے نہد از دشمنی
ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد

ہاں! آخر میں ایک بات اور عرض کردوں۔ یہ اقدار عالیہ کی غیر مشروط چاکری یہ وسعتِ مشرب، یہ دشمن کو رعایتیں دے کر دوست بنا سکنے کا ہنر، یہ سب کسی صاحب کمال میں ہوں، مگر ہو سکتا ہے کہ بس اسی کے ساتھ ختم ہو جائیں۔ کمال شخص کے لئے لازم تو نہیں کہ متعدی بھی ہو، دوسرے تک بھی پہنچے۔ لیکن خدمت خلق میں سچے دل سے لگنے والے جانتے ہیں یہ کام کسی ایک کے نمٹائے نہیں نمٹتا، چاہے وہ ایک کتنا ہی عظیم المرتبت ہو۔ یہ کام کسی ایک زمانہ میں ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ ہمیشہ کئے جانے اور ہوتے رہنے کا کام ہے۔ اس کے لئے دوسرے کام کرنے والے تیار کرنے ہوتے ہیں۔ اپنی جیسی شخصیتیں بنانی ہوتی ہیں۔ میں نے "اپنی جیسی شخصیتیں" ذرا ٹھیک نہیں کہا اس لئے کہ شخصیتیں تو کوئی دو بالکل ایک سی نہیں ہوتیں۔ ہر شخصیت اپنی یکسو انفرادیت کی اساس پر، اپنی گوناگوں صلاحیتوں اور استعدادوں سے متعین ہوتی ہے۔ لیکن سب اخلاقی شخصیتیں چاہے استعداد اور صلاحیت میں کتنی ہی مختلف ہوں رخ ایک ہی رکھتی ہیں: کسی قدر اخلاق کی سیوا کی امٹ لگن۔ شخصیت کی تعمیر کے اس کام کو جس خوبی اور یکسوئی سے اکابر صوفیہ نے انجام دیا ہے اس کی مثال تاریخ میں کم ملے گی۔ ہر آنے والی نسل کو اگر وہ اقدارِ اخلاقی کے خادموں سے اپنے کو بے نیاز نہ سمجھنے لگی ہو تو یہ کام کرنا ہے، ہمیں بھی کرنا ہے۔ اس میں ہم ان بزرگوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ حضرت محبوب الٰہی کی زندگی سے جنہوں نے سیکڑوں اخلاقی شخصیتوں کو گڑھ کر، کاڑھ کر ملک کے کونے کونے میں اپنا بنا کر بھیجا، اور اخلاقی اور روحانی زندگی کے احیاء کا ایک ایسا نظام قائم کر دیا کہ حیرت ہوتی ہے۔

دوستو! ہمیں ان نفوس قدسی سے ان کی یہی خصوصی صفتیں حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، ان کے دمِ جاں بخش سے اپنے سینوں کی کمہلائی آگ کو دہکانا چاہئے۔ کشف و کرامات کے تجسس میں جس کا دل لگتا ہے وہ ضرور ان کی تلاش

ان بزرگوں میں کرے۔ لیکن ان کے افکار و کردار کے اس انمول خزانہ کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیئے جس سے انھوں نے انسانی زندگی کو مالا مال کیا ہے۔ انکے تصرفاتِ فکری و روحانی سے کسب فیض کرنا چاہیئے۔ ایسا نہ سمجھے کوئی کہ یہ لوگ آج ہم میں نہیں ہیں۔ ہر طلب گار صادق کے سینہ میں یہ کشتگانِ خنجر تسلیم پھر سے زندہ اور اثر انداز ہو سکتے ہیں ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

(۴)

اُردو، ہندوستان کی زبان

دوستو! اُردو زبان کسی فرقے کی زبان نہیں ہے۔ کسی مذہب کی زبان نہیں ہے کسی حکومت کی چلائی ہوئی زبان نہیں ہے بکسی خاص نیت سے مصنوعی گڑھی ہوئی زبان نہیں ہے۔ یہ لوگوں کی جنتا کی زبان ہے۔ یہ فقیروں، سنتوں اور خادمانِ خلق کی زبان ہے۔ اُسے مسلمانوں کی زبان، مسلمانوں کی زبان، چلاّ چلاّ کر بتانا اور تعصبات کی ہوا دیکر نفرت کی آگ بھڑکانا کیسی ناروا بات ہے۔

بڑا ستم ہے دوستو! اور اگر جانا بوجھا ظلم نہیں تو کیسی بے سر و پیر کی بے تُک بات ہے۔ اور اگر بد دیانتی نہیں ہے تو کیسی نادانی ہے۔

اُردو ہندی کا جھگڑا ایک مدّت تک ہمارے دیس میں ہندو مسلمان جھگڑا بنا رہا، اس تاریخ کو بھلانا مشکل ہے مگر اب ہم آزاد ہیں اور ہمارے مسائل اب وہ نہیں ہیں جو پہلے تھے۔ ہمیں ان جھگڑوں کو بھولنے کی کوشش کرنا چاہیئے ورنہ ہم اپنی نئی زندگی کی تعمیر میں بڑی غلطیاں کریں گے۔

اب کسی کو یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اُردو ہندی کا رقیب ہے۔ اب کسی کو یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اُردو کی ترقی سے ہندی کا کوئی بھی نقصان [illegible] ہندی تو سارے دیش کی سرکاری زبان ہے۔ اُتر پردیش کی بھی سرکاری زبان ہے۔ دیش کی دوسری زبانوں کی ترقی سے اس کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس کا تو اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔

جو لوگ اُردو زبان کے لئے مخلصانہ کام کر رہے ہیں، انھیں اپنے مطالبے کی سچائی پر بھروسہ دکھائی دیتا ہے۔ اس میں ہندستانی سماج کی معقولیت پر اعتماد دکھائی دیتا ہے، باوجود ظاہری اسباب مایوسی کے اعتماد!

دلم بجوئے تو با صد ہزار نومیدی
بہ این خوش است کہ اُمید وار می گذرد

اس میں مجھے وہ نقش دکھائی دیتا ہے جو کہیں شعوری اور کہیں نیم شعوری طور پر کام کرنے والوں کے سامنے اپنے دلیں اور اس کے مستقبل کا ہے۔ اس جمہوری سماج کا نقشہ اس کی جمہوری ریاست کا نقشہ، جس کی بنیاد عدل اور انصاف پر ہوتی ہے۔ مجھے اس میں ایک ملی جلی گنگا جمنی تہذیب و تمدّن کا نقشہ دکھائی دیتا ہے جس سے ہماری قومی زندگی عبارت ہے۔ ——————

—— اس چمن کا نقشہ جہاں ہر رنگ میں بہار کا اثبات ہوتا ہے۔ جہاں لالہ و گل و نسرین کے جدا جدا رنگ پہ لوگ چڑھتے نہیں، خوش ہوتے ہیں، جہاں کثرت میں وحدت تلاش کرنے کی خو عام ہے۔ جہاں کل اپنے کو جز کا رقیب نہیں مانتا، اس کی تقویت کو اپنی مضبوطی جانتا ہے۔ مجھے اس میں لاکھوں شہریوں کا یہ یقین جھلکتا دکھائی دیتا ہے کہ ہماری ریاست کی نیو اخلاق اور نیکی اور انصاف پہ ہے اور اس نیو کو مضبوط بنانا ان کا فرض ہے۔ جو لوگ اس میں محض کسی کی ضد یا محض کسی کی فرقہ پرستی، کسی کی پاکستان دوستی، کسی کی ہندستان دشمنی، کسی کی ہندی دشمنی دیکھتے ہیں یا اوروں کو دکھلاتے ہیں وہ بڑی ہی غلطی پہ ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ غلط فہمی کے اسباب پر بھی کچھ عرض کر دوں۔

دوستو! میں نے ابھی جو اشارہ کیا ہے کہ لوگ ہمارے مطالبہ کی تہہ کو نہیں پہنچے ہیں اور اس کی من مانی تعبیریں کرتے ہیں تو وہ میں نے خالی اٹکل سے نہیں کہا ہے۔ یہ سب باتیں کہی گئی ہیں اور کہی جا رہی ہیں۔ کوئی کھُلم کھُلا تیز اور کڑوے انداز میں کہتا ہے، کوئی ذرا دھیمی سی لے میں۔ مگر بار بار کہا گیا ہے کہ اُردو کو علاقائی زبان بنانے کی کوشش فرقہ وارانہ کوشش ہے۔ اس میں مذہبی فرقہ پرستی کار فرما ہے، یہ مسلم لیگی ذہنیت کا مظاہرہ ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے ملک میں ہندو مسلم تعلقات

کی کشیدگی، سیاسی ہینیتروں کی ضرورت، مذہبی جذبات مشتعل کر کے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے ہتھکنڈے ان سب نے اُردو کے موجودہ مسئلہ پر بہت سے پردے ڈال دیئے ہیں۔ اس میں بہت سے ہندو مسلمانوں نے بہت سے اُردو والوں نے اور بہت سے ہندی والوں نے بہت کچھ کہا اور بہت کچھ کیا، جس پر کوئی بجا طور پر فخر نہیں کر سکتا۔ مگر مجھے اس وقت مسلمانوں کی طرف سے کچھ کہنا نہیں ہے۔

اس وقت تو اُردو کا ذکر ہے۔ اور کیسا ستم ہے کہ اُردو پر اور اُردو کے حامیوں پر کوئی فرقہ پرستی کا الزام لگائے۔ اُردو کسی فرقہ کی زبان نہیں ہے۔ کسی مذہب کی زبان نہیں ہے۔ کسی حکومت کی چلائی ہوئی زبان نہیں ہے کسی خاص نیت سے مصنوعی گڑھی ہوئی زبان نہیں ہے ——————

—— جن کے دل کو چوٹ لگی تھی اور وہ اسے دوسرے بھائی انسانوں تک پہنچانا چاہتے تھے اور جو ان سے محبت کرتے تھے اور کان دھر کر ان کی بات سننا چاہتے تھے، ان کے دلوں کی بولی ہے۔ یہ فقیروں اور خادمان خلق کی زبان ہے۔ بازار میں، کاروبار میں اور لین دین سے بنی ہوئی زبان ہے۔ منڈیوں میں مبادلہ اجناس کے ساتھ مبادلۂ افکار کے عمل کا نتیجہ ہے، ان کی زبان ہے جو کسی خاص روایت سے الیسے لپٹے ہوئے نہ تھے کہ ہر نئی بات سے بھڑکیں، ہر نئے اسلوب سے بدکیں، لوگوں ہی سے نہیں لفظوں سے بھی گھن کریں۔ یہ وسعت قلب کی زبان ہے، رواداری کی زبان ہے۔ محبت اور پریم کی زبان ہے۔ اس لئے ایسی کشادہ دامن زبان ہے، ایسی نمو پذیر زبان ہے، ایسی جاندار زبان ہے۔ یہ اس ملک کے اس اُتر پردیش کے علاقہ کے لینے والوں کے رابطۂ دلی اور رابطۂ ذہنی کا نتیجہ ہے؛ اور ان لینے والوں میں ہندو مسلم سکھ کا کوئی امتیاز نہیں۔

کس قدر غضب ہے دوستو کہ کوئی تربھون ناتھ ہجر، رتن ناتھ سرشار، پروفیسر رام چندر، منشی کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، برجموہن دتاتریہ کیفی، اور کشن پرشاد کول کی زبان پر مذہبی فرقہ واریت کا بہتان باندھے۔ دیا شنکر نسیم۔ جوالا پرشاد برق، برج نرائن چکبست۔ درگا سہائے سرور، رگھوپتی سہائے فراق۔ منشی نولکشور، پنڈت منوہر لال زتشی، سر تیج بہادر سپرو، منشی دیا نرائن

نگم اور مہاراجہ کشن پرشاد کی زبان پر تنگ دلی کی تہمت لگائے جس میں آریہ سماج تحریک کا تمام تر مواد موجود ہو، جس سے عیسائی مشنریوں نے پورا کام لیا ہو ایسے مسلمانوں کی زبان مسلمانوں کی زبان چلا چلا کر بتاتا اور تعصبات مذہبی کی ہوا دے کر نفرت کی آگ بھڑکانا کیسی ناروا بات ہے؟ بڑا ستم ہے، دوستو! اور اگر جانا بوجھا ظلم نہیں تو کیسی بے سر پیر کی بے تُک بات ہے اور اگر بد دیانتی نہیں تو کیسی نادانی ہے۔

پھر مذہبی تعصب سے پورا کام نہ چلے تو سیاسی تعصب سے بھڑکایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اُردو مذہبی زبان ہے۔ لیکن کیا کیجیے کہ تاریخی اور ادبی شعور پکار پکار کر کہتے ہیں کہ نہ یہ زبان بدیسیوں کی زبان ہے، نہ بدیسی زبان ہے۔ لسانیاتی نقطۂ نظر سے دیکھیے تو اس میں افعال اور حروف اور عام ضرورت کے اسم سب ہندی ہی ہیں۔ صوتی اعتبار سے دیکھیے تو اس کا ایران و عرب سے کوئی رشتہ نہیں۔ اس میں آوازوں کی بہت بڑی تعداد ہندوستانی ہے اور لو اور رسم خط تک میں جس کے غیر ملکی ہونے پر بہت زور دیا جاتا ہے، درجنوں ہندوستانی آوازیں ہیں، جیسے ڈ، ٹ، دھ، ڈھ، ڑ، ڑھ، کھ، بھ، پھ، جھ، چھ، کھ، گھ وغیرہ جنھیں کون غیر ملکی بنا سکتا ہے، مگر کہنے والوں کا منہ کون بند کرے۔

اگر کسی کو وحدت کی اس تجویز سے خطرہ ہی نظر آتا ہو تو یاد رکھنا چاہیے کہ کسی ریاست میں دو یا دو سے زیادہ زبانوں کو تسلیم کر لینے سے اس کی تہذیبی وحدت میں رخنے نہیں پڑتے۔ اس وقت بھی پنجاب اور مدھیہ پردیش میں ایک سے زائد زبانیں سرکاری طور پر تسلیم کی جاتی ہیں۔

اپنے شہریوں کے جائز حقوق کو پورا کرنے سے ان کے جذبات کا احترام کرنے سے ان کو سہولتیں بہم پہنچانے سے، ان کی عزیز اور بیش قیمت چیزوں کی حفاظت اور ترقی میں ان کی مدد کرنے سے وحدتِ قومی پیدا ہوتی ہے۔ جذبۂ قومی ایک زندہ کارفرما جذبہ بنتا ہے۔ وفاداری ایک ذہنی وابستگی اور روحانی دل بستگی بن جاتی ہے۔

اس کے مطالبے نہیں کیے جاتے، اس کے ثبوت نہیں مانگے جاتے۔ ساری قومی زندگی کی خوش نیتی اور خوش عملی، منصفانہ خوش معاملگی اور برادرانہ رواداری اسے ایک بے تحاشا فطری کیفیت کی طرح ہر شہری کے ذہن میں رچا دیتی ہے۔ وحدت

قومی کا جذبہ نہ تو دور تا باتیں ماننے سے مرتا ہے نہ خالی فقرہ بازیوں، طفل تسلیوں، یا دھمکیوں سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم کہ آج اپنی قومی زندگی کے ابتدائی دور سے گزر رہے ہیں، ہمیں اس گُر کو اچھی طرح سمجھنا چاہیئے۔ اس کے لئے زبان کو شدھ کرنے کی ضرورت نہیں، دل کو صاف کرنا چاہیئے۔

پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُردو تو کوئی الگ زبان نہیں، وہ تو بس ہندی کا خاص اسلوب ہے۔ یا مظہر العجائب! اس زبان کی حمایت مسلم لیگی ذہنیت کا مظاہرہ بھی ہے، اس کے حامیوں کو ہجرت کا مشورہ بھی ہے، وہ بدیسی زبان بھی ہے، ایک غیر ملکی تسلط کی ناقابل برداشت یادگار بھی ہے، اور وہ کوئی الگ زبان بھی نہیں۔ یہ خوب ہے صاحب! اسی سے ٹھنڈا، اسی سے گرم، دونوں قسم کے الزام تو دُرست نہیں ہو سکتے۔ یہ صحیح ہے کہ اُردو اور ہندی ایک ہی جڑ سے نکلے ہوئے دو تنے ہیں، لیکن دونوں تنے الگ الگ بڑھے ہیں۔ یہ دونوں زبانیں ایک ہی سوت سے پھوٹے ہوئے دو دھارے ہیں۔ مگر یہ دونوں دھارے الگ الگ بہتے رہے ہیں اور اپنی موجودہ صورت میں ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ اس لئے اردو بولنے والوں کے مطالبے کو کہ ان کی زبان کو اس کا واجب حق ملنا چاہیئے، یہ کہہ کر ٹالنا کہ اُردو تو ہندی کا محض ایک اسلوب ہے، ذہنی دیانت کا پتہ نہیں دیتا۔ اس وقت تو اُردو ایک علیحدہ زبان ہے جو ہندوستان کی دوسری زبانوں کی بہ نسبت مشترک قواعد کی وجہ سے ہندی کے قریب تر ہے۔ مگر ہر صورت میں اس کا لہجہ، محاورہ اور اس کے ادبی اسالیب ہیں جو اسے ہندی سے ممتاز کرتے ہیں۔ اور نئی ہندی جس ڈگر پر ڈالی جا رہی ہے، افسوس ہے کہ اس سے یہ فرق بڑھ ہی رہا ہے، گھٹ نہیں رہا ہے۔ یہ تو معروف عام ہے کہ دستور ہند نے اُردو کو دوسری بڑی ہندوستانی زبانوں کے ساتھ ایک علیحدہ زبان تسلیم کیا ہے۔

.... اسی مسئلہ پر ایک دوست سے گفتگو ہو رہی تھی۔ ان کے ہاتھ میں بالِ جبریل کا نسخہ تھا۔ انھوں نے جھٹ اسے کھولا اور بتایا کہ بہ نیت فال کھولا ہے تو یہ شعر سامنے آیا ہے:

"خضر کیونکر بتائے کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے"

اردو میری زبان

(۲۷ر نومبر کو ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ کے انتظام میں اردو نمائش اور کتب خانہ کا افتتاح کرتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر حسین گورنر بہار نے اس نمائش کی خصوصیات کی طرف اشارہ کیا، اور ادارہ تحقیقاتِ اردو کی خدمات کو سراہا۔ اس کے بعد انھوں نے اردو زبان کے متعلق حسبِ ذیل خیالات ظاہر کئے)

مجھے اس عام خوشی اور افتخار سے کچھ زیادہ خوشی، کچھ زیادہ افتخار اس لئے محسوس ہو رہا ہے کہ یہ دونوں کام جو اس وقت انجام پا رہے ہیں اردو زبان سے تعلق رکھتے ہیں، وہ زبان جو میں نے پہلے پہل اپنی ماں سے سیکھی تھی، جس میں میری ذہنی پرورش ہوئی، جس میں اب تک سوچتا ہوں، جس کے علمی اور ادبی سرمایہ سے اپنی استعداد کے بقدر فیض اٹھایا ہے۔ اور یہی نہیں کہ اس سے مجھے شخصی اور ذاتی لگاؤ ہے بلکہ اس لئے بھی کہ ایک وفادار ہندستانی شہری کی حیثیت سے مجھے یہ زبان اس زندگی کے پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کی بشارت دیتی ہے جو ہم سب ہندستانی اپنے آزاد دیش میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس زندگی کی روح کیا ہے؟ اس کی روح ہے اور ہمیشہ سے رہی ہے کثرت میں وحدت کی تلاش، الگ الگ اور طرح طرح کے عناصر سے ایک ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کے بنانے کی آرزو جو رنگ برنگ کے تمدنی پھولوں کو وحدتِ قومی کے ڈورے میں پرو کر ایسا ہار بنانا چاہتی ہے کہ وہ ہار گوندھ کر انسانیت کی گردن میں ڈالا جائے تو اس کی شوبھا کو بڑھا دے۔ جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ:

"ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا"

یہ کہنے کی ہمت رکھتی ہے کہ

"ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے"

.........جس میں کل اپنے کو جزو کا رقیب نہیں سمجھتا ہے، اس کی طاقت کو اپنا بل جانتا ہے۔ ہندوستانی زندگی کے تہذیبی مظاہرے میں مجھے یہ روح اردو زبان میں بڑے ستھرے اور نکھرے ہوئے روپ میں دکھائی دیتی ہے" اور اردو تاریخ پر تحقیقاتی کام مجھے اس وجہ سے اور بھی اہم دکھائی دیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادبی تأمل سے یہ بات بالکل روشن ہو جائے گی کہ اردو نہ کسی فرقے کی زبان ہے، نہ کسی مذہب کی زبان ہے، نہ کسی حکومت کی زبردستی سے چلائی ہوئی زبان ہے، نہ کسی خاص نیت سے مصنوعی، گڑھی ہوئی زبان ہے، یہ تو جنتا کی بولی ہے ــــ لوگوں کی زبان ہے، آپس کے میل جول کا پھل ہے۔ میلوں، ٹھیلوں، بازاریوں، منڈیوں کی ریل پیل میں بولی ہوئی زبان ہے۔ زندگی کے بیوپار کے کانٹوں میں تلی ہوئی زبان ہے۔ چیزوں کے لین دین کے ساتھ وچاروں کے لین دین کا نتیجہ ہے۔ یہ فقیروں اور سنتوں کی زبان ہے جو اپنے معرفت میں ڈوبے ہوئے دل کی بات اوروں تک پہنچانے کے لئے بیکل تھے اور جن کی من موہنی باتیں سننے کو عام لوگ کان لگائے رہتے تھے، اس لئے یہ محبت اور پریم کی زبان ہے، رواداری کی زبان ہے، میل ملاپ کی زبان ہے، اس کا دل بھی بڑا ہے۔ اس کی جھولی بھی بڑی ہے۔ یہ نئے انداز سے جھکتی نہیں، نئی بات پر بدکتی نہیں۔ لفظوں سے گھنیاتی نہیں، وچاروں سے چھوت چھات نہیں کرتی۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اردو کے یہ گن خواہ مخواہ گا رہا ہوں۔ ان کا ذکر اس

لئے کرتا ہوں کہ ہمیں جو سماج بنانا ہے اس میں جوڑنے والی طاقتوں کو ابھارنا ہے، توڑنے والی طاقتوں کو دبانا ہے۔ زبان جوڑنے والی طاقت ہے۔ ہر زبان جوڑتی ہے، پر ہر زبان والے اسے اپنے کو دوسروں سے الگ کرنے کا آلہ بنا لیتے ہیں، اس پر لڑتے ہیں، کٹتے مرتے ہیں، ایک دوسرے پر تہمتیں باندھتے ہیں، ایک ہی دیس میں ایک زبان والا علاقہ دوسری زبان والے علاقے سے ایسا برتاؤ کرتا ہے جیسے کوئی پرایا دیس ہو۔ یہ سب بڑی بھول کی باتیں ہیں۔ اور آج جب کہ دیس کو اپنی آزاد زندگی کی پہلی کٹھن منزل درپیش ہے، اتحادِ قومی از بس ضروری ہے۔ ان جھگڑوں میں پھنس کر ہم ان مشکلوں کا سامنا کیسے کرسکیں گے جو آگے دکھائی دے رہی ہیں (اردو چونکہ دیس کے کسی علاقے میں محدود نہیں ہے، ہر جگہ ہی اس کے بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں اس لئے اس کو توحدت قومی کے بیدار کرنے میں سب سے آگے ہونا چاہیے) لیکن پچھلی تاریخ نے اس میں بھی بہت سے پیچ ڈال دیئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے یہ پردیسی زبان ہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ یہ خالی مسلمانوں کی زبان ہے نہ پردیسی زبان ہے۔ اور اچھا مان لو کہ یہ مسلمانوں ہی کی زبان ہوتی تو بھی ہماری آزاد جمہوری زندگی میں یہ کوئی عیب کی بات نہ ہوتی۔ ہر آدمی جو ہمارے دیس میں رہتا ہے، اسے اپنا دیس جانتا ہے اس کی عظمت کو مانتا ہے، اس کے مطابق چلتا ہے، وہ ہمارا بھائی ہے، ساتھی ہے، دوست ہے۔ اس کی ترقی ہماری ترقی ہے، اس کی بھلائی ہماری بھلائی ہے۔ مگر اردو تو خالی مسلمانوں کی زبان ہے بھی نہیں۔ کوئی فہرست نہیں بنائی ہے، جو نام اس وقت یاد آگئے ہیں لیتا ہوں اور پوچھتا ہوں کہ ترکھبون تجبر جوالا پرشاد برق، رتن ناتھ سرشار، پروفیسر رامچندر، سدرشن، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی۔

برجموہن دتاتریہ، نسیم، چکبست، سرور جہاں آبادی، فراق گورکھپوری،
منشی نول کشور، لالہ سری رام صاحب خمخانۂ جاوید، پیارے لال، منشی دیا نرائن
کی زبان کو کوئی مسلمانوں کی زبان کیسے بتاتا ہے۔ اور اس زبان پر مذہبی تنگدلی
اور تنگ نظری کی پرورش کرنا، کون سی دیانت ہے کون سی فراست ہے۔

پھر اردو نہ بدیسیوں کی زبان ہے نہ بدیسی زبان ہے۔ ذرا ابھی دیکھئے
تو قدم قدم پر اس کی شہادت ملتی جائے گی۔ لسانی نقطۂ نظر سے اس کے
افعال اور حرف اور عام ضرورت کی باتیں سب ہندوی ہیں۔ اس کی
آوازوں پر کان دھریئے تو ایران اور عرب سے کوئی رشتہ نہیں ملتا۔
آوازوں کی بہت بڑی تعداد خالص ہندستانی ہے عربی لفظوں میں جو اجنبی
آوازیں آئی ہیں انھیں بھی بول چال میں اپنا لیا ہے۔ لکھائی میں بھی اس
کے پردیسی ہونے پر بہت زور دیا ہے ؛ درجنوں ہندستانی آوازوں
کے ظاہر کرنے کا اس میں سامان ہے، اس میں ڑ، ڈ، ٹ، ڈھ، تھ،
بھ، پھ، جھ، چھ اور ٹھ کیا پردیسی زبانوں کے نشان ہیں ؟

دوستو! شاید اس وقت یہاں اردو دوست زیادہ جمع ہوں، آپ
سے یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کا فرض ہے کہ اپنی عزیز زبان کی روح
کو آپ کسی حال میں مسخ نہ ہونے دیں۔ کوئی اس روح سے ناواقف ہو
تو اسے بتائیں کہ یہ روح کیا ہے؟ اس روح کو تازگی بخشیں کہ ایک اچھی سماجی
زندگی کے بنانے میں آپ کا ادب کسی اور سے پیچھے نہ رہے۔ زبان اور ادب
کا مقابلہ یہ نہیں ہے کہ کسی سے روٹھ گئے، کسی کو برا سمجھ لیا، کسی کو دبا دیا۔ اس
میں جیت اُسی کی ہے جو خدمت کے میدان میں اوروں سے بازی لے
جائے۔ مقابلہ اس میں سمجھئے کہ کس زبان کے گیت قوم کے دل کو گرماتے

ہیں، کس کا ادب صالح اقدار کی ترویج کا ذریعہ بنتا ہے۔کون اچھّے آدمی، اچھی زبان اور اچھے سماج کے بنانے میں، اس کو عدل و انصاف، صداقت و امن کی بنیادوں پر مضبوط کرنے میں، غلطی پر جرأت سے روکنے میں، نیکی کو فراخدلی سے سراہنے میں، دماغوں کو تنگ نظری اور تنگ دلی کے جالوں سے صاف کرنے میں، علم کی سرحدیں آگے بڑھانے میں، آدمی نے جن سچائیوں کا سراغ لگایا ہے، کہیں لگایا ہو، ان سے اپنے ہم وطنوں کے ذہن کو منور کرنے میں، جذبۂ قومی کو ایک قومی اور مؤثر جذبہ بنانے میں، وطن اور اس وطن کی اچھّائیوں اور خوبیوں سے وہ ذہنی وابستگی اور روحانی دلبستگی پیدا کرنے میں جو قومی وفاداری کی جڑ ہے، کون زبان دوسری زبان سے زیادہ کارگر ہے۔ یہ نیکی کا مقابلہ ہے۔ اس میں جیت اور ہار نہیں ہوتی اس میں مقابلہ کرنے والے ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہیں۔ اور دوسرے کے آگے بڑھ جانے پر بھی اتنا ہی خوش ہوتے ہیں جتنا خود اپنے آگے بڑھنے پر۔

میری التجا ہے اور مجھے امید ہے کہ تاریخی اتفاقات نے اردو ہندی کے تعلق میں جو گتھیاں سی ڈال دی ہیں وہ اردو اور ہندی دونوں کے کام کرنے والے مل کر اپنی سوجھ بوجھ اور صاف دلی سے اس طرح سلجھائیں گے کہ یاد بھی نہ رہے گا کہ کبھی یہ الجھن پیدا بھی ہوئی تھی۔ محبت سے، کہتے ہیں ٹوٹے ہوئے دل جڑ جاتے ہیں اور ایسے جڑتے ہیں کہ پتہ نہیں چلتا کہ کہاں بال پڑا تھا۔ ؎

دلِ شکستہ درآں کوے می کنند درست
چناں کہ می نشناسی کہ از کجا بشکست

میں نے پہلے بھی کہا ہے اور اب بھی کہتا ہوں کہ اردو کسی طرح ہندی کی رقیب نہیں ہے۔ سب ہندستانی شہری، ان کی زبان کچھ بھی ہو، دستور ہند کے مطابق ہندی کو دیس کی سرکاری زبان مانتے ہیں اور اس کی ترقی میں ہاتھ بٹانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اردو والے بھی اس سے باہر نہیں ہیں۔ پھر اردو ہندی کی رقیب کیسے ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ بھی ہندستانی دستور کی تسلیم کی ہوئی قومی زبانوں میں سے ایک ہے۔ اور ہندی سے سب سے قریب ہے۔ اس لئے اگر اردو والوں کو کہیں کوئی شکایت ہو کہ ان کی زبان کی ترقی میں کوئی رکاوٹ ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ ان کی طرف سے پیروی ہندی والے کریں۔ اس سے بھروسہ اور محبت کے ایسے سوتے پھوٹیں گے کہ ساری قومی زندگی اس سے سیراب ہوگی۔ سارے دیس میں لسانی سیاست کا رنگ ہی بدل جائیگا۔ ذہنی تعاون کی راہیں کھل جائیں گی۔ آپس کا ربط بڑھے گا تو کیا عجب ہے کہ سارے دیس میں ایسی حسین اور شیریں زبان، ایسی مستند اور مدھر اور کومل بھاشا کا چلن ہو جائے جو بس ہزاروں کی گنتی میں عالموں اور ودوانوں تک محدود نہ ہو بلکہ کروڑوں آدمیوں کے لئے میں اپنی جگہ بنا سکے۔

ہمارے شاعر

(بچوں کی زبان میں)

۱- محمد حسین آزاد مرحوم - اردو میں نئے طرز کی نظم کے بانیوں میں ہیں نثر بے مثل لکھتے تھے - ان کی کتاب "آب حیات" بہت مشہور ہے، ایک شعر سنئے:

یوں پھوٹ کے جوں ہی گل و ریحاں نکل پڑے
کیا جانے کن دلوں کے ہیں ارماں نکل پڑے

۲- خواجہ الطاف حسین حالی - پانی پت کے رہنے والے تھے، جہاں حافظ فیاض صاحب اور شیخ مفتاح الدین صاحب کا وطن ہے ان کی شاعری نے مسلمانوں کو سوتے سے جگایا ان کا مسدس ضرور پڑھئے اس وقت تو ایک رباعی سناتا ہوں:

دنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو — ہر چیز کو یاں کی آنی جانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا — ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

۳- ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم - دہلی کے رہنے والے تھے - تقریر و تحریر دونوں لاجواب تھیں - قومی نظمیں بھی لکھتے تھے ان کے شعر کچھ پسند نہیں اس لئے آپ کو نہیں سناتا -

۴- مولانا شبلی مرحوم - اعظم گڈھ کے رہنے والے تھے جہاں خاکسار کا بھی وطن ہے (ڈاکٹر صاحب کا نہیں بلکہ نور خاں کا کیوں کہ مضمون تو یہی سنا رہے تھے) اردو کے بہت بڑے مصنف تھے، ان کی "سیرۃ النبی" تو سب کو پڑھنی چاہیئے - فارسی اردو دونوں میں شعر کہتے تھے - ان کا مشہور شعر ہے :

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اُبھر آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں

۵- اسد اللہ خاں غالب - ہماری زبان کے شاعروں کے سردار ہیں - لوگ ان کے شعر پڑھتے اور سر دُھنتے ہیں - دیکھئے کیا شعر کہا ہے :

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا!

۶- ڈاکٹر اقبال - لاہور میں رہتے ہیں، وہی جنھوں نے ترانہ لکھا تھا - پڑھنے والوں میں گرمی پیدا کرتے ہیں - اسی ترانہ کا شعر ہے :

اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

۷- اکبر الٰہ آبادی - بڑے مزے کے شاعر تھے - باتیں پتے کی کہتے تھے - ان کے شعر پڑھو تو ہنسی آتی ہے، اور ان پر غور کرو تو رونا، ایک شعر سنئے :

شیخ جی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے
ایک ہیں خفیہ پولس میں ایک پھانسی پاگئے

۸- حکیم اجمل خاں مرحوم - ہماری جامعہ کے بانی تھے - ان کا دیوان بہت خوبصورت جرمنی میں چھپا ہے - مکتبہ میں ملتا ہے - کیا اچھا شعر ہے :

آغوش مرگ ہی کو کیا ہم نے اختیار
آخر یہ چارۂ مرض لادوا کیا

۹- مولانا محمد علی جوہر مرحوم - ہماری جامعہ کے سب سے پہلے شیخ الجامعہ تھے - اُن کے کلام میں بڑا اثر تھا - شعر دل میں اتر جاتے ہیں - سنیئے :

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

۱۰۔ سروجنی نائیڈو۔ بلبل ہند کہلاتی ہیں مگر شعر انگریزی میں کہتی ہیں۔ آج کل جیل میں ہیں۔

۱۱۔ ڈاکٹر ٹیگور۔ ہندوستان کے ملک الشعرا مانے جاتے ہیں۔ ساری دنیا میں آپ کا کلام ترجموں میں پڑھا جاتا ہے۔ بنگالی زبان میں شعر کہتے ہیں۔ مشہور کتاب "گیتا نجلی" ہے۔

لیتا ہے دل میں غم مرے آرام اس طرح
سنسان جنگلوں میں پڑے شام جس طرح

[نوٹ :۔ جامعہ کے طلبا کا مشاعرہ تھا جس میں اس کی صدارت بھی لڑکے ہی نے کی تھی۔ ہال میں ہر سمت مشہور شعرا کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ذاکر صاحب سے نہ رہا گیا بچوں کے لئے ہر ایک شاعر کے حالات فقط دو دو تین تین جملوں میں اور اس کے ساتھ ہی اپنی پسند کا ایک ایک شعر لکھ لیا۔ اور اس کو کسی لڑکے کے ہی ذریعہ جلسہ میں پیش کرنے کی فرمائش اس طرح کی۔ "میری کبھی ایک چیز اپنے کسی لڑکے سے پڑھوا دیجئے" اس طرح محمد نور خاں نے اس کو جلسہ میں ایک اچھے انداز میں پیش کیا تھا۔ [ادارہ پیام تعلیم]

بچوں کے لئے کہانیاں

یہ کہانیاں بہت دن ہوئے رقیۃ ریحانہ کے نام شائع ہو چکی ہیں۔ مجھے انھیں نے سنائی تھیں اور یہ کہہ کر سنائی تھیں کہ کہیں پڑھی ہیں یا کسی سے سنی ہیں، مگر یاد نہیں کب اور کہاں! میں نے ان سے پائی تھیں اس لئے انھیں کے نام سے پہلے شائع کیں۔ پھر رقیۃ ریحانہ ہمیشہ کو رخصت ہو گئیں اور میں یہ بھی نہ پوچھ پایا کہ میں نے جس طرح ان کی کہانیوں کو لکھا ہے وہ انھیں پسند بھی ہے یا نہیں۔ لیکن چونکہ لکھی میرے ہاتھ سے گئی تھیں، اور لوگ جانتے ہیں، اس لئے اب انھیں اپنے نام سے شائع کرتا ہوں۔ کس کس کو بتاؤں کہ رقیۃ ریحانہ کون تھیں اور کہاں چلی گئیں۔ سہل یہی ہے کہ کہانیوں کی ساری ذمہ داری اپنے سر لے لوں۔ کہانی اپنے کہنے والے کی اچھائی برائی کو بے تکلفی سے اپنے اندر لے لیتی ہے۔ یہ کہانیاں آپ کو پسند آئیں تو سچ یہ ہے ان کی ساری خوبی رقیۃ ریحانہ کی دین ہے، اگر طبیعت کو نہ بھائیں سمجھیں کہ میرے بیان نے انھیں بگاڑ دیا ہے۔ مگر ایک بار پڑھ ضرور لیں؛ تھوڑی سی ہیں، وقت ضائع نہ ہوگا۔

غالب میموریل عمارت

میں ریاست دہلی کے لیفٹننٹ گورنر صاحب کا دل سے شکرگزار ہوں کہ انہوں نے ہمارے ملک کے مایۂ ناز اردو اور فارسی زبان کے بے مثل شاعر، اردو کی جدید نثر کے بانی، مرزجان مرنج انسان دوستی اور وسیع المشربی کی تمثال، ہمسر عرفی و طالب اسد اللہ خاں غالب کی یادگار عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کا شرف مجھے بخشا۔ اس بات کی مجھے اور بھی خوشی ہے کہ یہ موقع مجھے دہلی میں ملا کہ غالب ان لوگوں میں ہیں جن سے اس مردم خیز شہر کی آبرو ہے۔ یہ وہ تاریخی شہر ہے جس میں سب سے زیادہ واضح طور پر ہندوستانی تہذیب کے ایک گنگا جمنی تہذیب ہونے کے تصور نے عملی شکل لی۔ ملک کے ہر سچے بہی خواہ کا یہی ارمان ہونا چاہئے کہ اس کی آئندہ ترقی اس ڈگر پر چلے۔ اردو زبان، مجھے یہ کہنے میں خوشی ہوتی ہے کہ ہندوستان کے تمدن کے اس رجحان مقدس کا مظہر ہے۔ دہلی اس کا گھر ہے، اس کا مرکز رہا ہے۔ دہلی کے چپہ چپہ پر اس کے آثار زمانہ کی بے اعتنائی کے باوجود نمایاں ہیں۔ اس کے بنانے سنوارنے

نکھارنے والوں کے تاروں جیسے درخشاں جھرمٹ اس کی خاک تلے روپوش ہیں۔

چپہ چپہ پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

دہلی ہی ان کی آرزوؤں، ولولوں اور کاوشوں کا مرکز تھا۔ سیکھنا سکھانا بننا بنانا، کہنا اور سننا، دینا اور لینا کھلے دل کے ساتھ دینا اور ساتھ لینا ان کا شعار تھا۔ انھوں نے ہندوستان کی اس تقدیر کو جو آج پھر اس پر منکشف ہو رہی ہے آج سے صدیوں پہلے تاڑ لیا تھا۔ اور جان گئے تھے کہ ان کے پیارے وطن میں قدرت آدمیت کا ایک نیا سانچہ بنانا چاہتی ہے جس میں متعدد قوموں اور بھانت بھانت کے تمدنوں کا امتزاج ہوگا۔ ایسا لگتا ہے کہ ابھی کبھی سینوں میں بہت سے ناموافق حالات کے باوجود بھی کہ یہ سانچہ اب پہلے سے بھی زیادہ بڑے پیمانے پر ہندوستان کی شوکت عمل سے شاید سارے جہان میں بنے گا۔ اور اس کے بنانے کے شرف میں ہمارا پیارا دیس کسی اور سے پیچھے نہ رہے گا۔ میں خیال کی رو میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ مقصد اس بات پر اپنی احسان مندی اور مسرت کو ظاہر کرنا تھا کہ ایک ایسے نامور کی یادگار کی بنیاد رکھنے کے لیے آپ نے مجھے یاد کیا جس کے نام لینے سے یہ سب خیال دل میں آنے لگتے ہیں مجھے امید ہے کہ جس عمارت کا سنگ بنیاد آج رکھا گیا ہے وہ جلد بن کر تیار ہو جائیگی مگر عمارت کا بن جانا پہلی اور سب سے غیر اہم منزل ہے۔ عمارتیں تو مقبرہ بھی بنکر رہ جاتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس میں زندگی کی قوتیں کارفرما ہوں تو دعا کرتا ہوں کہ اس عمارت میں کام کرنے والوں کی ایسی مدد ہو کہ وہ غالب کو نئے نئے روپ میں قوم کے سامنے زندہ کر کے لائیں اور جو افکار اور جو اقدار غالب کی زندگی میں کارفرما تھیں ان کو دل اور دماغ دونوں کے سہارے سمجھیں سمجھائیں۔ اور ان کی تنقید سے بھی نہ گھبرائیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا تھا۔ اگلے سال ان کی سو سالہ برسی منائی جائیگی۔ اس موقع پر غالباً غالب کے سلسلے میں بہت سے ادارے بہت سے کام انجام دیں گے۔ ان کی کتابوں کے تنقیدی ایڈیشن جگہ جگہ سے نکلیں گے۔ ان کی زندگی سے متعلق بہت سے سوال جن کا جواب اب تک اطمینان بخش نہیں ملا، ان کی کھوج کی جائے گی۔ غالب پر پچھلے دنوں خاصا

تحقیقی کام ہوا بھی ہے لیکن بہت کچھ اور ہو سکتا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کام کی صحیح جگہ یونیورسٹیاں ہیں کہ تلاش حق میں ریاضت ان کا منصب اور ان کا فرض ہے جن چیزوں کی بعض دفعہ بظاہر بہت چھوٹی چھوٹی باتوں کی تحقیق میں یہ اہل علم سر کھپاتے ہیں وہ باہر والوں کو حقیر معلوم ہوں مگر سچ یہ ہے کہ ان کے کام کا بڑا اہم جز ہیں۔
جب کوئی شاعر یا ادیب یا مورخ یا مدبر ایسے بلند مرتبے کو پہنچ جاتا ہے جیسا کہ غالب کو شعر و ادب کی دنیا میں نصیب ہے اور یونیورسٹی اسے توجہ کا مستحق مان لیتی ہے تو پھر ہر چھوٹی بڑی بات مستحق توجہ ہو جاتی ہے اور تحقیقی کام کے سبھی آداب ہر جزئیے میں ملحوظ رکھنے ہوتے ہیں مگر شاعر پر توجہ کا ایک اور بڑا میدان خود اس کا شعر ہے۔ قطع نظر اس کے کہ استاد کون تھے اور نانی کا حال معلوم ہے یا نہیں یا ماموں کے متعلق سب تفصیلیں جمع کر لی گئی ہیں یا نہیں۔ اس لیے کہ میرے خیال میں شعر ایک وجود مستقل رکھتا ہے شاعر سے الگ۔ کوئی گنگناتا ہے آپ کے سامنے کہ ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا
سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

تو پہلے آپ سر دھنیں گے یا یہ پوچھیں گے کہ اس شاعر کی نانی اور ماموں کے متعلق تفصیلات بتاؤ۔ آپ کو اگر نہ معلوم ہو کہ شعر کس نے کہے ہیں تو بھی کیا آپ کے دل میں نہ اتر جائیں گے۔ سچ ہے کہ یہ دنیا آدمیوں اور چیزوں کی غالب کو ضرور گھیرے ہوئے تھی اور اس کا جتنا سراغ لگ جائے اچھا ہی ہے مگر یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ایک دنیا وہ ہے جو غالب نے خود بنائی ہے، بسائی ہے سجائی ہے۔
الفاظ اور معنی کی ایک دنیا جو اپنا مستقل وجود رکھتی ہے۔ اس دنیا میں اترنے اس سے لطف اندوز ہونے، کبھی کبھی اس میں گم ہو جانے کا سامان ہونا چاہئے اور مجھے امید ہے کہ یہ یادگار جو آج آپ بنانا شروع کر رہے ہیں اس کام میں مدد دے گی۔
غالب کی بنائی ہوئی دنیا کا شہری بننے میں صاحبان طلب کو مدد دے گی۔ مجھے امید ہے

کہ یہاں غالبؔ سے متعلق ہر کتاب خواہ وہ کسی بھی زبان میں ہو یہاں سے مل سکے گی۔ شعر کی ماہیت سے متعلق غالبؔ کے ہمعصر شاعروں کے متعلق، غالبؔ کے عہد سے متعلق مکمل سے مکمل سرمایہ یہاں جمع کرایا جائے گا مشاعرے اور مناظرے بھی یہاں ہوا کریں گے اور ذوق شعری کی تربیت کے جتن بھی کیے جائیں گے۔ خود اس عمارت کی اندرونی سج دھج ایسی بنائی جا سکے گی کہ غالبؔ کا زمانہ آنکھوں کے سامنے آئیگا

میں آخر میں حجّا صاحب اور فخرالدین علی احمد صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اس موقع پر مجھے یاد فرمایا اور زیادہ شکرگزار اس وقت ہوں گا جب یہ یادگار قائم ہو جائے گی اور وہ کام انجام دے گی جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔

۵

حالیؔ، مُحبِّ وطن

مجھے حکم ہوا ہے کہ حالیؔ صدی کے اِس مبارک جشن کے موقع پر حالیؔ کے مُحبِّ وطن ہونے کے متعلق کچھ عرض کروں۔ دنیا کے جن ملکوں کا حال کچھ بھی ہم جیسا رہا ہے اُن کے ممتاز محبّانِ وطن کا خیال آتے ہی سوُلی کے تختے، پھانسی کی رسّی، محبس کی تیرہ و تار کوٹھریوں اور سلاسل کی جھنکار، تنہائیوں اور رسوائیوں، ناکامیوں اور بدنامیوں، دشت نوردی اور آبلہ پائی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ آپ سب کو معلوم ہے کہ حالیؔ اس قسم کے مُحبِّ وطن نہ تھے۔

پھر محبّانِ وطن کی وہ صف سامنے آتی ہے جنھوں نے اپنے وطن کی خاطر دوسروں کے وطن فتح کئے، اپنی آزادی کو مستحکم بنانے کے لئے دوسروں کی آزادی سلب کی، اپنے دیس کی رونق کے لئے دوسرے ملکوں میں خون کی ندیاں بہائیں، اپنے عیش و آرام کے لئے دوسروں کو بے گھر بے در کیا،

اپنی تہذیب کو ترقی دینے کے واسطے دوسروں کے تمدن تباہ و برباد کئے، حالیؔ ان محبانِ وطن میں بھی نہ تھے۔

ان عملی لوگوں کو چھوڑ کر اہلِ فکر میں محبانِ وطن کی تلاش کیجئے تو بڑے بڑے بلند پایہ ادیب اور شاعر اور فلسفی ملیں گے اپنی "خاکِ وطن کا جن کو ہر ذرہ دیوتا ہے" جن کے نظامِ اخلاق میں وطن قدرِ اعلیٰ ہے اور وطن کا مفاد حق و باطل، خیر و شر کا معیار ہے جنھیں اپنی ہر چیز اچھی معلوم ہوتی ہے اور دوسرے کا سب کچھ بُرا۔ حالیؔ ان محبانِ وطن میں بھی نہ تھے۔

اور کیا تعجب ہے؟ حالیؔ غریب جان دیتا تو کس وطن کے لئے، یا دوسروں کی جان لیتا تو کس کی خاطر، اور جس وطن کا وجود ہی نہ تھا اس کے مفاد کو معیارِ خیر و شر بنانا چاہتا بھی تو کیسے بناتا۔ حالیؔ نے جس وطن میں زندگی شروع کی وہ زیادہ سے زیادہ ایک جغرافیائی تصور تھا۔ اُس کے باشندوں میں نہ مقاصد کا اتحاد تھا، نہ اغراض کی یکجہتی، نہ کوئی مشترک مطمحِ نظر تھا، نہ کوئی سیاسی تنظیم۔ حالیؔ کی نسل کے لوگوں کا کام پہلے تو وطن کو وجود میں لانا تھا کہ یہ جب محفل میں آئے تو محفل ہی درہم برہم ہو چکی تھی۔ انحطاط و انتشار کے آثار تو مدتوں سے موجود تھے، پر ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے بساط ہی الٹ دی تھی۔ مدت کے فتنہ و فساد کی مصیبت کے بعد امن و آشتی کا منہ دیکھا تو اس سے کیوں متأثر نہ ہوتے اور اس خلفشار کے بعد اس امن کو قومی شیرازہ بندی کی مہلت کیوں نہ سمجھتے؟

حالیؔ نے بھی اپنے مُرشد سید احمد خاں اور دوسرے ممتاز ساتھیوں کی طرح انگریزی تسلط کو اسی نظر سے دیکھا۔ اسی لئے اُس پر اطمینان کا اظہار اور اسی وجہ سے اُس کے ساتھ تعاون کی تلقین کی۔ میرا خیال ہے کہ اگر حالیؔ آج زندہ ہوتے تو بھی برطانیہ ہندوستان کے اس تعلق کو جو اس ہنگامہ خیز عہد میں پہلی مرتبہ مستحکم ہوا تھا اچھا ہی جانتے اور ذمہ داری اور وفاق کی خوش آیند توقعات کی وجہ سے وہ حالات کے تغیر کے باوجود بھی شاید دونوں قوموں کے لئے اس تعلق کو برقرار رہنے کے متمنی ہوتے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اگر ان توقعات کے پورا ہونے کے قرائن نہ ہوتے اور محکومیتِ مطلق کی جگہ شریکِ حکومت ہونے کی امید قوی نہ ہوتی جاتی تو حالیؔ کا وطن دوست دل اس

تعلق کی ذلت کے احساس سے خالی اور اس کی زبان اس احساس کے اظہار سے محترز نہ رہتی۔ اس لیے کہ اس وقت بھی جب اور سب کو اس تعلق کے برکات ہی نظر آتے تھے اور خود حالیؔ کی عقل اس تعلق کے افادہ کی مقر تھی اس کے دل میں ضرور ایک کانٹا سا کھٹکتا تھا، جس کے دکھ کا اظہار عقل کی پاسبانی کے باعث رُک رُک کر ہی سہی، مگر ہوتا ضرور تھا!

حالیؔ ان لوگوں میں تھے جن کی طبیعت میں مصائب و آلام سے غصہ کی آگ کی جگہ سوزِ دل کی دھیمی دھیمی گرمی اور درد کی میٹھی میٹھی کسک پیدا ہوتی ہے، دوسروں سے نفرت کی جگہ اپنوں سے محبت بڑھتی ہے۔ جو بے صبری سے جھلانے اور بھرنے کی جگہ سعیٔ پیہم کا عزم کرتے ہیں، جو تخریب کی سہل اور ڈھلوان سڑک کی جگہ تعمیر کی دشوار گزار راہ اختیار کرتے ہیں؛ اور دور از کار اگرچہ بظاہر شاندار منصوبوں کی خیالی تخلیق کی جگہ اُن پیش پا افتادہ اور بظاہر حقیر کاموں کو پورا کرنے میں لگ جاتے ہیں جو ان منصوبوں کے رو براہ آنے کی شرطِ اوّل ہیں، جو ہمہ گیر سیاسی اور معاشی اداروں کو قوم کی عام اخلاقی اور ذہنی حالت کا آئینہ دار سمجھتے ہیں، اس لئے ان اداروں میں تغیر سے پہلے اس اخلاقی اور ذہنی حالت کو بدلنا ضروری خیال کرتے ہیں، جو نئی دنیا کے بنانے کے لئے نئے نئے آدم کی تخلیق اور نئی تعمیر کے لئے نئے نئے معماروں کی تربیت لازمی جانتے ہیں؛ جو اس سے واقف ہوتے ہیں کہ بظاہر عظیم الشان ادارے اخلاقی احساس کی کمزوری سے دیکھتے دیکھتے متزلزل ہو جاتے ہیں اور بظاہر کمزور اخلاقی قوتیں اپنی غیر منطقی توسیعی صلاحیتوں کے باعث عظیم الشان اور غیر متوقع تبدیلیاں پیدا کر سکتی ہیں۔

اس ہنگامہ میں جسے بعض لوگ نادانی سے ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی کہتے ہیں اور بعض غدر، اس نے خود غرضی و نفس پرستی، بے ترتیبی اور بدنظمی کا مایوس کن منظر دیکھ دیکھ کر خون کے آنسو بہائے اور دوسری طرف ایک نئی تہذیب اور ایک نئے تمدن کی آمد آمد کا شور سنا۔ اس نو وارد کے بے حساب مادی وسائل دیکھے اور ان مادی قوتوں کی مستحکم علمی اور اخلاقی بنیادوں کو سمجھا تو اُس کا دل کانپ اُٹھا کہ یہ اس کے وطن کے لئے جینے مرنے کی بات تھی، نہ جانے وطن اس حادثہ سے جانبر ہوگا کہ نہیں۔

وطن کو بحیثیت قطعۂ زمین محبوب بنانے سے ہی، اور "خاکِ وطن کے ذرّہ ذرّہ کو دیوتا" مان لینے سے ہی اس وطنیت کی بنیاد پڑتی ہے جو ایک غیر عقلی مذہب بن کر دوسروں کے وطن سے نفرت اور دوسرے دیس والوں سے جدال و قتال کی طرح ڈالتی ہے۔ حالیؔ مسلم تھے اور اسلام کی عالمگیر برادری کی ہوا لگنے کے بعد اس تنگ وطنیت کا زہر اثر نہیں کرتا۔ حالیؔ نے اس اُتھلی وطن پرستی کے حق نما مظاہر میں بھی خود پرستی و خود غرضی کے پوشیدہ جھوٹ کو پہچان لیا اور "اُن گھر کی چوکھٹ کے چومنے والوں" کے لئے وہ صحیح تصوّر قائم کیا جس میں وطن کے معنی اہلِ وطن کی بے غرض خدمت اور بے لاگ سیوا کے ہیں کہ پہلی وطنیت تو انسان اور حیوان میں مشترک ہے، اور دوسری وطن دوستی انسان

کا امتیازی شرف! میرا تو خیال ہے کہ ہندوستان کے ادب میں پہلی مرتبہ حالیؔ ہی نے حُبِّ وطن کے اس صحیح تصوّر کی تلقین کی ہے۔ اور انفرادی اغراض کی بندگی کے ظلمت کدہ میں بے لوث جماعتی خدمت کا دیا اُنھیں نے روشن کیا ہے۔ اور جب تک ہمارے دیس کی مشترکہ قومی زبان اُردو زندہ ہے اُس کی نظر فروز روشنی میں صحیح حُبِّ وطن کی راہ ہندیوں کو ملتی رہے گی۔

حالیؔ نے اُس عملی آدمی کی طرح جو اپنی آواز کو بے نہایت وسعتوں میں ضائع نہیں کرنا چاہتا، زیادہ تر مسلمانوں کو مخاطب رکھا۔ اُنھیں جگانے میں ساری زندگی کھپا دی، اُن میں اجتماعی زندگی کا احساس پیدا کرنا چاہا، اخلاقی قدروں کی اہمیت انھیں سمجھائی، اُن کی معاشرت پر نکتہ چینی کی، ان کے تمدن پر اعتراض کئے، ان کے امیروں کو شرمایا ہے اور ڈرایا ہے، اُن کے غریبوں کو ہمت دلائی ہے، ان کے علما کو اپنے فرائض یاد دلائے ہیں ان کے شاعروں کی بے مغز بکواس کا تمسخر کیا ہے، انھیں تحصیل علم کی رغبت دلائی ہے، تجارت کا شوق دلایا ہے، محنت اور مشقت پر آمادہ کیا ہے، ننگ بندگی کا احساس پیدا کیا ہے، غیرت دلائی ہے، ہمت بندھائی ہے۔ خود خون کے آنسو بہائے ہیں اور انھیں بھی رلایا ہے، پھر محبت کے ہاتھوں سے اُن کے آنسو پونچھے ہیں، اور یہ سب کچھ اس تاثیر کے ساتھ کیا ہے کہ ان کی تاریخ سیاسی ہیں، تاریخ تعلیمی میں، تاریخ معاشرت میں، تاریخ ادب میں، جہاں کہیں پچھلی نصف

صدی میں کسی صحیح حرکت کی روانی دکھائی دے تو اس کا سلسلہ اس ادیب، شاعر، مصلح، محبِ وطن اور سب سے زیادہ اس صاف دل اور فرشتہ خصائل انسان کی کاوشِ ذہنی کے چشمۂ صافی سے جا ملتا ہے جس کی ولادت کی صد سالہ برسی منانے میں ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں۔

لیکن کیا مسلمانوں کی اس خدمت کی وجہ سے حالی کو محبِ وطن کہنے کا حق ہمیں باقی نہیں رہتا؟ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں، اور افسوس کہ بعض لوگ ایسا سمجھتے ہیں، انھیں خود اپنے دل اور اپنی نظر کا علاج کرنا چاہیے۔ وہ حالی جس نے ملک میں سب سے پہلے (یعنی خود انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے کئی سال پہلے) حُبِ وطن کا ایسا وسیع تصور ہندوستانیوں کے سامنے پیش کیا جس میں اس دیس کے سب باسی شامل ہو سکیں، جس نے انفرادیت اور خود پرستی کو اجتماعی خدمت کا سبق سکھایا۔ جس کی زبان قلم سے، جس نے کونسا ادارہ اور کونسا طبقہ ہے جس کے دل پر نشتر کا کام نہیں کیا ہے پر جس سے ایک حرف، ہاں ایک حرف، ایسا نہ نکلا جس سے کسی ہم وطن کا دل اس لئے دُکھا ہو کہ وہ کسی دوسرے مذہب پر چلتا ہے، جس نے اپنی شخصی زندگی میں مختلف المذاہب لوگوں سے محبت و مودّت کی وہ وضع بنائی جس کے نمونے اس قوم پرستی کے دور میں مفقود ہوتے جاتے ہیں، وہ صرف اس جرم میں محبِ وطن نہیں باقی رہتا کہ وہ اپنی قوتوں کا بیشتر حصہ مسلمانانِ ہند کی خدمت اور انھیں بیدار کرنے میں صرف کرتا ہے! جو ایسا سمجھتا ہے وہ یا تو عمل میں تاثیر اور کمال کے لئے حدود مقرر کرنے کے گُر سے نا آشنا ہے یا غریب مسلمانوں کو ہندوستانی ہونے کا شرف نہیں بخشنا چاہتا۔ اور یہ دونوں صورتیں قابلِ افسوس ہیں۔

پہلی صورت میں وہ لوگ ہیں جو کسی کام کو چاہے ذہنی ہو چاہے عملی اس کے پورے آداب کے ساتھ کرنے کی نہ خواہش رکھتے ہیں نہ صلاحیت مگر شیخیت بگھارے بغیر رہ بھی نہیں سکتے۔ یہ لوگ چند الٹی سیدھی تقریریں کر کر کے اور اخبارات میں موقع بے موقع بیانات شائع کرا کرا کے سمجھتے ہیں کہ بس محبانِ وطن کی صفِ اوّل میں آگئے اور اب ہر کسی کو محبِ وطن ہونے کی سند اُن سے حاصل

کرنی ہوگی۔ اُن کا بیان چھپ گیا اور قوم کی اصلاح ہوگئی اور وطن کی نجات کا سامان! انھیں نہ کسی کو جگانا ہے، نہ کسی کو سدھارنا، یہ ساری دنیا کو مخاطب کرسکتے ہیں۔ دقت صرف ذرا سی ہے کہ دنیا ذرا اونچا سنتی ہے۔ اور جب سُننے پر مجبور ہوتی ہے تو ایک کان سے سُن کر دوسرے سے نکال دیتی ہے۔ ان محبانِ قوم کی تعداد کا اندازہ روز بروز مشکل ہوتا جاتا ہے۔

ان بے چاروں کو کیا خبر کہ جس کے دل کو کسی کام کی تکمیل کی لگی ہوتی ہے وہ مجبور ہوتا ہے کہ اپنی تاثیر کے حلقے کو اپنی قوتوں کا اندازہ کرکے محدود کرے۔ حالیؔ کے سامنے وطن کے بے شمار مہتم بالشان کاموں میں سب سے قریب مسلمانوں کی اصلاح کا کام تھا کہ یہ بھی تو اسی ہندی قوم کا ایک جزو ہیں اور اس قوم کی تاریخ میں ان کا بھی کچھ کم حصہ نہیں رہا۔ یہ خود بڑا کام تھا اور آج تک اس قدر کام باقی ہے کہ اگر حالیؔ پھر پیدا ہوں تو صحیح طور پر پھر اپنی ساری عمر انھیں کے سدھارنے میں صرف کردیں۔ اور ضرورت ہے کہ مدتوں تک ہزاروں مخلص خادمانِ قوم و وطن انھیں کی خدمت میں اپنی زندگیاں کھپا دیں۔ حبِّ وطن کا وہ کون مالکِ مطلق ہے جو کسی مسلمان محبِّ وطن کو جس کی محبت وطن کے لئے کسی طرح کسی دوسرے سے کم نہ ہو اس بات سے منع کرسکے کہ وہ اپنی قوتیں مسلمانوں کی ترقی اور اصلاح میں صرف کرے تاکہ ان کی درستی اور قوت سے ہندوستانیوں کی درستی اور قوت ہو اور ان کی ترقی سے دیس کو چار چاند لگیں۔

اور وہ دوسرے لوگ جو نہایت بلند آہنگی سے اپنی حبِّ وطن کا اعلان فرمائیں گے، لیکن ہندوستانی زندگی سے ان تمام چیزوں اور نشانیوں کو رفتہ رفتہ مٹانے کے درپے ہیں جو اس زمانے کی یادگار ہیں جب کہ اس دیس کے مسلمان باشندوں کے ہاتھ میں اس کی سیاسی باگ تھی انھیں اپنی تنگدلی پر شرمانا چاہیئے۔ قومیں یوں نہیں بنتیں کہ کوتاہ بین لوگ اپنے تعصبات کے اندھے پن میں اس کی تمدنی زندگی کے نہایت قیمتی عہد کو کالعدم کردیں۔ جو لوگ ہندوستانی زندگی کا یہ تصور رکھتے ہیں کہ اس میں سے اسلامی عناصر یک قلم خارج کئے جائیں گے، اور جو ایسا کرنے کی مہلک اور وطن دشمن مساعی میں مصروف ہیں، انھیں

اس سچے محبِ وطن کی یاد کے جشن کے موقع پر ناکامی ونامرادی کی بشارت ہوا
انھیں چاہیئے کہ تربینی پر جہاں گنگا جمنا کا سنگم ہوتا ہے اور گنگا کے مقدس مگر
ذرا گدلے گدلے اُٹھتے دھارے میں جمنا کا گہرا صاف نیلگوں دھارا آکر ملتا ہے
اور پھر دونوں مل کر آگے ہمارے عزیز ملک کے سب سے آباد اور زرخیز حصہ کو
سیراب کرتے ہیں، اس سنگم پر جاکر ان دونوں دھاروں کو جنھیں قدرت نے
اپنے مصالح سے ملایا ہے جدا کرنے کی کوشش کریں۔ جب تک یہ اس دشوار
کام کو انجام دیں مسلم محبّان وطن اور بہی خواہانِ قوم و ملک کو وطن کی خدمت کا
یہ طریقہ اختیار کرنے کی بھی اجازت ہو کہ وہ مسلمانوں کو جگائیں کہ ان کے فروغ
سے بھی وطن کا فروغ اور ان کی تباہی میں بھی وطن ہی کی تباہی ہے۔ اور
جب حبِ وطن کا کوئی بزعمِ خود غلط اِجارہ دار انھیں اس راہ سے ہٹانے پر مصر یا
ان کی حبِ وطن کے تسلیم کرنے سے منکر ہو تو اسے حالی کا یہ شعر نرمی سے سنا
دیا جائے ؎

قیس ہو، کوہکن ہو، یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں!

(۱۹۳۵ء)

بدنصیب ملک کی بدنصیب سیاست

خدا کے لئے اس ملک کی سیاست کو شدھاریئے اور جلد سے جلد ایسی ریاست کی طرح ڈالیئے جس میں قوم قوم پر بھروسہ کر سکے کمزوروں کو زور آور کا ڈر نہ ہو، غریب امیر کی ٹھوکر سے بچا رہے جس میں تمدن تمدن امن کے ساتھ پہلو بہ پہلو پھل پھول سکیں اور ایک سے دوسرے کی خوبیاں اُجاگر ہوں جہاں ہر ایک وہ بن سکے جس کے بننے کی اس میں صلاحیت ہے اور وہ بن کر اپنی ساری قوت کو اپنے سماج کا چاکر جانے میں جانتا ہوں کہ ان باتوں کا کہہ دینا سہل ہے اور کرنا کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ آج یہ بات ہمارے سیاسی رہنماؤں کے ہاتھ میں اتنی ہے جتنی کہ پہلے کبھی نہ تھی کہ کچھ سمجھ کر کچھ سمجھا کر کچھ مان کر کچھ منوا کر ایسی ریاست کی نیو رکھ دیں۔ جب تک یہ نہیں ہوتا ہم تعلیمی کام کرنے والوں کا حال قابلِ رحم ہے۔ ہم کب تک اس سیاسی ریگستان میں ہل چلائیں۔ کب تک شبہ اور بدگمانی کے دھوئیں میں تعلیم کو دم گھٹ گھٹ کر مرتے دیکھیں۔ کب تک ہم اس ڈر سے تھراتے رہیں کہ ہماری عمر بھر کی محنت اور عمر بھر کی محبت کو کوئی ایک سیاسی حماقت کوئی ایک سیاسی فساد بھسم کردے گی۔ ہمارا کام بھی کوئی پھولوں کی سیج تو ہے نہیں! اس میں بہت مایوسیاں ہوتی ہیں اور اکثر دل ٹوٹتا ہے، پھر جب ہمارے قدم ڈگمگائیں تو ہم کہاں سہارا ڈھونڈیں؟ کیا اسی سماج میں جس میں بھائی بھائی یکدل نظر نہیں آتے کوئی قدر آخری قدر نہیں معلوم ہوتی جس میں کوئی گیت نہیں جو سب مل کر گائیں کوئی تہوار نہیں جو سب مل کر منائیں۔ کوئی شادی نہیں جسے سب مل کر رچائیں کوئی دکھ نہیں جسے سب بٹائیں۔ ہماری یہ مشکل دور کیجئے، اب بھی بہت دیر ہو چکی ہے۔ اور دیر نہ جانے کیا دن دکھائے۔

تاریخ کس کی روداد، تہذیب کی یا وحشت کی؟

آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ اس دورِ آزادی میں تاریخ کو تفریقی سیاست کا آلہ کار بنانا ختم ہو چکا ہے۔ جی نہیں۔ آج بھی یہ رجحان باقی ہے اور خاصا قوی ہے۔ آج بھی یہ دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہندوستان میں ہندو مسلم تہذیبوں میں کبھی میل نہیں ہوا ہمیشہ ٹکر ہوتی رہی اور آئندہ بھی ہوتی رہے گی ——————

—— جب تک ایک تہذیب دوسری تہذیب میں جذب نہ ہو جائے۔ اس لئے آپ کو اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے کہ آپ کی سعی ابھی ناتمام اور آپ کا کام ابھی ادھورا ہے۔ آپ کو اور زیادہ محنت، ہمت اور استقلال کے ساتھ یہ جدوجہد کرنی ہے۔ تاریخ نگاری کو اس کجروی سے محفوظ رکھنے کی اور یہ واضح کرنے کی کہ گو قرونِ وسطیٰ میں ہندو مسلم تہذیبوں کے اپنے دائرے تھے، لیکن ان میں ایک مشترکہ قطعہ بھی تھا جو اس عہد میں قومی تہذیب کی حیثیت رکھتا تھا۔

میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے آپ زبردستی تاویل سے کام لیں۔ یہ نہ تو دیانت دار مورخوں کی حیثیت سے آپ کے لئے جائز ہے اور نہ آپ کو اس کی ضرورت ہے۔ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ اس کے ثبوت تاریخ کے صفحوں پر بکھرے ہوئے ہیں، صرف انھیں جمع کرنے اور ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ میرا یہ پختہ خیال ہے کہ دنیا میں کہیں بھی دو تہذیبوں میں ٹکراؤ نہیں ہوا۔ تہذیبیں ٹکرایا نہیں کرتیں وحشتیں ٹکرایا کرتی ہیں۔ انسان کا وجود اس دنیا میں اربوں سال سے ہے۔ اس میں سے تہذیب کے چند ہزار سال نکال دیجئے تو باقی سارا زمانہ وحشت کا تھا۔ اس لیے آج ان افراد اور قوموں میں جنھیں ہم مہذب کہتے ہیں، تہذیب کی ایک ہلکی سی پرت کے نیچے نہ جانے کتنی پرتیں وحشت کی دبی ہوتی ہیں جو موقع ملنے پر ابھر آتی ہیں۔ دو قوموں کی تہذیبیں جب تک اپنی وحشتوں کو دبائے ہوئے ہیں، آپس میں لڑتی نہیں بلکہ گلے ملتی ہیں اور تہذیبی قدروں کا لین دین کرتی ہیں، مگر جب ان کی وحشتیں ان کی تہذیبوں پر غالب آجاتی ہیں تو ایک تہذیب دوسری تہذیب سے بھڑ جاتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کا منہ نوچنے، کاٹنے اور بھنبھوڑنے لگتی ہیں۔

آپ سے میری یہ التجا ہے کہ وحشتوں کی روداد دوسروں کے لئے چھوڑ دیجئے آپ

تہذیبوں کی کہانی لکھئے اور نئے ہندوستان کو ماضی کی روشنی میں حال کا یہ اہم ترین مسئلہ حل کرنے میں مدد دیجئے کہ کس طرح مختلف تہذیبوں کے الگ الگ رنگ و آہنگ کو ضروری حد تک قائم رکھتے ہوئے ان میں وہ ہم آہنگی پیدا کرے جو ایک متحد اور مضبوط قوم بنانے کے لئے درکار ہے۔

بھائیو! دوستو! ساتھیو!

بھائیو، دوستو، ساتھیو! میں نے یہ تینوں لفظ جان کر بولے ہیں، آدمی کو آدمی کا بھائی قدرت بناتی ہے ۔ ہم کو تم کو قدرت نے ایک دیس میں پیدا کیا ہے ۔ اسی مٹی سے ہم سب بنے ہیں، اسی کی مٹی میں ہم سب ملتے رہے ہیں، اسی میں پلے بڑھے ہیں اور اسی میں مرتے، جلتے، گڑتے ہیں ۔ اس کے تاروں سے سرگوشیاں کرنے والے پہاڑوں کی طاقت اور مضبوطی، اس کے میدانوں کو موت کے بعد زندگی بخشنے والے دریاؤں کا فیض رساں بہاؤ، اس کے جنگلوں کی عارفانہ دم کشی، اس کی چڑیوں کی چہک، اس کے پھولوں کی مہک، یہ سب تم جانو کہ نہ جانو، ہمارے تمہارے سب کے رونگٹے رونگٹے میں بسے ہوئے ہیں ۔ ہم نے تم نے سب نے اس کے ہر آرام اور اس کے ہر دکھ میں ایک ساحصہ پایا ہے ۔ اس کی نسیم نے سب سے ایک سی اٹھکھیلیاں کی ہیں اور اس کی لُو نے ہم سب کو ایک سا جھلسایا ہے ۔ اس کی زمین نے جو اگلا ہے اس سے ہم سب نے پیٹ پالا ہے اور اس کے کالوں اور قحطوں نے ہم سے کبھی نہیں پوچھا کہ تم

ہندو ہو مسلمان ہو یا سکھ ہو، اس کے جانوروں نے تمہاری ہماری سب کی مدد کی ہے (اور ہاں، اس کے سانپوں نے تم کو، ہم کو، ہاں تم کو اور ہم کو یکساں ڈسا ہے اور تم کو ہم کو یکساں فائدہ پہنچایا ہے، قدرت نے جو رشتہ جوڑا ہے اسے توڑنے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟

ہاں، تم شاید کہو کہ آدمی خالی قدرت کا حصہ نہیں۔ پتھر نہیں، پودا نہیں، جانور نہیں ہے کہ قدرت نے جو بنا دیا وہی رہے۔ یہ آدمی ہے۔ اپنی دنیا آپ ہی بناتا بگاڑتا ہے۔ تو یہ بالکل سچ ہے، اسی لئے تو میں نے تمہیں دوست کہہ کر پکارا ہے۔ ہم کو تم کو قدرت نے ہی ایک دیس میں پیدا کر کے بھائی نہیں بنایا ہے بلکہ ہم اپنی خوشی سے مل جل کر صدیوں ساتھ رہے ہیں۔ غم شادی میں ایک دوسرے کے شریک رہے ہیں، آپس میں سلوک کئے ہیں، ایک دوسرے کے عیبوں سے چشم پوشی کی ہے، ہنر ڈھونڈے ہیں، سیکھے ہیں، سکھائے ہیں، ایک نے اپنی کمی دوسرے سے پوری کی ہے، ایک دوسرے کو برتا ہے، پرکھا ہے، سمجھا ہے، محبت کی ہے، وفاداری کی سب رسمیں نباہی ہیں، ایک دوسرے کے جان و دل میں دخیل رہے ہیں، غلامی کی اندھیری رات کو اسی ٹمٹماتے دیئے کے سہارے کاٹ کر سحر کی ہے۔ آزادی کا سورج نکلتے ہی کیوں دل پلٹے جا رہے ہیں، کیوں نگاہیں بدلی جاتی ہیں۔ دوستو، دوستی کی رسمیں نباہو، دوستوں کو دشمن نہ جانو، کسی عارضی جنون میں صدیوں کی دوستیوں کو ختم نہ ہونے دو۔ مجنونوں کا علاج کرو، وہ بھی بھائی ہیں، وہ بھی دوست بن جائیں گے۔ دشمن جان کر دوستی اور وفاداری کے مطالبے نہ کرو، دوستی سے وفاداری کی جڑیں مضبوط کرو۔ دوستی کا پودا شبہ اور بدگمانی اور نفرت کی زمین میں جڑ نہیں پکڑتا، محبت، بھروسہ اور یقین سے کام لو اور

دیکھو کہ اس میں یہ پودا کیسا لہلہاتا ہے اور اس پر وفا کے پھول کھل کر کس طرح اپنی خوشبو سے کینہ اور کپٹ کی گندی فضا کو مہکا دیتے ہیں اور اپنی شفاف خوش رنگی سے شک اور شبہ کے گدلے پن کو کیسے کاٹ دیتے ہیں۔ بھائیو، دوست بنو، دوستی کے حق ادا کرو، دوستی کے تقاضے پورے کرو اور پورے کراؤ۔

بھائی دوست بن جائیں تو اس عظیم الشان کام میں جو ہم سب کے سامنے ہے ساتھی بھی بن سکتے ہیں۔ دوستو، دیکھو، صدیوں کی غلامی کے بعد، ایسی غلامی کے بعد جس نے ہمارے بدنوں ہی کو نہیں جکڑا تھا، جس نے ہمارا پیٹ ہی نہیں کاٹا تھا، جس نے ہمیں وباؤں اور طاعون ہی کا شکار نہیں بنا رکھا تھا، بلکہ جس نے جہل اور بے علمی کے بوجھل طوق بھی ہماری گردنوں میں ڈال رکھے تھے، جس میں ہم سوچنا سمجھنا بھول گئے تھے، جس میں ہم سے بھلے برے کی تمیز چھن گئی تھی، جس میں ہم زہر کو امرت سمجھنے لگے تھے، جس میں ظلم سہتے سہتے ہمارے سینوں میں ظلم کرنے کے ارمان پرورش پانے لگے تھے، جس میں ہم نے اپنا پیٹ بھرنے کے لئے دوسروں کو بھوکا مارنے کا ہنر پیٹ بھر کر سیکھ لیا تھا، جس کی شیطانی کمک پر ہم انسانوں سے جانوروں کا سا سلوک روا رکھتے تھے، جس میں ہم نے پیسہ کو خدا بنا لیا تھا اور خود غرضی کو اپنا دھرم ایمان، جس میں ہم اپنا الو سیدھا کرنے کی خاطر مذہبی تعصبات کو بے روک ٹوک اکسانے اور بھائی کو بھائی کے اور دوست کو دوست کے خلاف کھڑا کر دینے کا انچھر سیکھ گئے تھے، جس نے ہمیں ٹکڑیوں میں بانٹ کر ہماری قومی زندگی کو تتر بتر کر دیا تھا، وہ غلامی ابھی دو مہینے ہوئے کہ قانوناً ختم ہوئی ہے۔ قانوناً۔ عملاً تو وہ اس وقت ختم ہوگی جب ہم تم سب مل کر، اپنے ایکے سے، اپنی سوجھ بوجھ سے، اپنے فولاد جیسے جسموں کی مشقت سے جن پر گولیاں پھسل جائیں

اور اپنے ان دلوں سے جن میں اپنے ساتھیوں کی چھوٹی سے چھوٹی مصیبت اور بپتا سے ایک ٹیس اُٹھے، اپنی محنت سے، اپنی محبت سے، اپنی مایوسی اور تھکاوٹ سے، بے پرواکوشش سے، اپنی نفرت اور طرفداری سے، بڑی مخلصانہ خدمت سے، ان سارے روگوں کو دور کر دیں گے جو غلامی نے ہم میں پیدا کر دئے ہیں۔ ساتھیو، کیسا بڑا کام ہے، کیسا کٹھن، پر کیسا پیارا کام! جن زندگیوں کو اس پیارے کام میں کھپانا ہے اُنھیں نفرت کی تلوار سے ہلاک کرتے ہو؟ جن قوتوں کے بغیر اس پیارے کام کو انجام دینے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے انھیں برباد کرتے ہو؟ کیسی نادانی ہے، کیسی ناسمجھی ہے، کیسا جنون ہے؟ ساتھیو، اب سب سے پہلا کام یہی ہے کہ اس نادانی کو دور کردو، اس ناسمجھی کو ہٹاؤ، جنون کا ہاتھ پکڑلو۔

میں جانتا ہوں کہ یہ سن کر تم میں سے بہتوں کے دل میں کیا خیال آئیگا۔ ہزاروں بار اسے سُن چکا ہوں، روز سیکڑوں بار سنتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ہم مجنون نہیں ہیں، مجنون کوئی اور ہے، ہم جنون کا بدلہ لے رہے ہیں۔ ہاں اگر تم بدلہ ہی لے رہے ہو تو جنون کا بدلہ جنون سے لے رہے ہو، اور یہ خود جنون کی علامت ہے۔ بدنصیب ہے، بدنصیب وہ آدمی اور بدبخت ہے، بدبخت وہ قوم جو اپنے پن کی ترازو کسی اور کے پاپ کو بنائے، جو کسی اور کی بداعمالی کو اپنے عمل کا معیار قرار دے۔ برائی کی نقل کرنے سے کبھی اچھائی پیدا نہیں ہوئی ہے، گناہ کی پیروی کرکے کوئی ثواب کی منزل تک نہیں پہنچا ہے۔

بھائیو، دوستو، ساتھیو۔ مسلم، ہندو، سکھ، سب اپنے اپنے سینہ پر ہاتھ دھرو اور سوچو، اپنے ضمیر کی آواز پہ دھیان دو تو تم کو پتہ لگے گا کہ گناہ ہم

سب نے کیا ہے۔ جی بھر کر گناہ، جی بھر کر ظلم۔ ہم میں سے کسی کو شرم سے آنکھ اٹھانے کا یارا نہیں۔ گناہ کے پیالے کی تلچھٹ تک ہم سب نے چاٹ ڈالی ہے۔ تب ہی تو سب کے غم کا پیمانہ بھی لبریز ہے۔ اس غم کو غصہ میں نہ بدلو۔ شرماؤ۔ شرماؤ اور توبہ کرو سب کے سب، شرماؤ، توبہ کرو۔ ایک دوسرے پر الزام لگا کر، دوسرے کے گناہ کو اچھال کر اور اپنے کو دبا کر یہ نہ سمجھو کہ تم اپنے ضمیر کی آواز کو ہمیشہ کے لیے چپ کر سکتے ہو۔ وہ تمہیں برابر ستائے گی، وہ تمہاری نیندیں حرام کرے گی، اور جس نے اُسے دبا کر چپ کر دیا وہ تو سخت ہی بدنصیب ہے۔ وہ انسانیت کے درجہ کو ہمیشہ کے لئے چھوڑتا ہے، جانوروں کو بھی اسے اپنے زمرہ میں لینے سے عار ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی قوم کی قوم ایسا کرتی ہے تو وہ ہمیشہ کے لئے مہذب قوموں کی صف سے اپنے کو نکالے جانے کا حقدار بناتی ہے۔

بھائیو، دوستو، ساتھیو۔ اپنی انسانیت کو بچاؤ، اپنی قوم کے مہذب زندگی کے حق کو تلف نہ ہونے دو۔ تہذیب اور انسانیت اور شرافت کی وہ پیاری پونجی جو ہم نے غلامی کی گھٹا ٹوپ رات میں نفاق کی آگوں سے، خود غرضی کے طوفانوں سے بچا کر نکالی تھی اسے آزادی کی پو پھٹتے وقت خاک میں ملاتے ہو؟ ایسا نہ کرو۔ اسے بچاؤ اور تہیہ کرو کہ اپنی زندگی کو اس پیارے کام میں کھپا دو گے جس کی ذمہ داری آزادی نے تمہارے کاندھوں پر رکھی ہے۔ اور یاد رہے کہ اس کام کو نفرت کی گندگی میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں اور دلوں سے کبھی انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے لئے ضرورت ہے محبت کی، بھروسہ اور یقین کی!

(٦)

ہندوستان اور مسلمان

آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کر دوں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں جہاں شخصی خودغرضیاں تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے۔ اور مسلمان کسی حال میں بھی یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس بات پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں اس لئے کہ مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا، سو ہوگا ہی، خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔

گرچہ مثل غنچہ دل گیریم ما　　　گلستاں میرد اگر میریم ما

یہی وجہ ہے کہ سچے مسلمان ہندوستان میں اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ، اپنی تمدنی خدمات، اپنے تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملی وجود کو خود اپنے لئے ہی بے بہا نہیں سمجھتے بلکہ ہندوستانی قومیت کے لئے نہایت بیش قیمت جانتے ہیں اور اس کے مٹائے جانے یا کمزور کیے جانے

کو اپنے ہی ساتھ ظلم نہیں ہندستانی قوم کے ساتھ بھی خیانت سمجھتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا دیس کسی سے کم عزیز نہیں ہے۔ وہ ہندوستانی قوم کا جزو بننے پہ فخر کرتے ہیں۔ مگر وہ ایسا جزو بننا کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں اُن کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔ ان کا حوصلہ ہے کہ اچھے مسلم ہوں اور اچھے ہندی۔ اور نہ کوئی مسلمان انھیں ہندی ہونے پر شرمائے اور نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے پہ انگلی اُٹھائے۔ ہندوستان میں ان کا دین ملک سے بے تعلقی کا عذر نہ ہو، بلکہ خدمت کی ذمہ داری پر ڈالے، اور وہ اُن کے لئے عیب نہ ہو بلکہ امتیاز۔

مسلمان

مسلمان ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ایک خاص جماعت سے تعلق رکھتا ہے اور اسی کے دنیاوی اور سیاسی ادھیڑبن میں لگا رہتا ہے۔ مسلمان پر ساری دنیا کی ذمہ داریاں بھی ہیں، اپنے ملک کی بھی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ مسلمان ہونے کے معنی ہیں ذہنی زندگی کا ایک مطمح نظر رکھنا، اقدار کا کوئی نظام ماننا، شائستگی کے کچھ معیار تسلیم کرنا، پست و بلند، خوب و زشت کے کچھ پیمانے برتنا، صالح انفرادی اور صالح اجتماعی زندگی کا کوئی نقشہ، فرد اور جماعت کے ربط کا کچھ تصور ذہن میں رکھنا۔ اور یہ سب محض ذہنی اور فکری تسکین اور توازن کے لئے نہیں بلکہ زندگی کو بنانے اور سنوارنے کے لئے انفرادی تکمیل اور اجتماعی ترقی کی راہیں متعین کرنے اور ان پر گامزن ہونے کے لئے، منزل کے تعین اور اس کی طرف بڑھنے کی توانائی حاصل کرنے کے لئے۔ شکر ہے کہ آج پھر ہمیں اپنی حقیقت کا کچھ کچھ احساس ہوتا جاتا ہے، ہم کچھ سمجھتے جاتے ہیں کہ قومی زندگی کا وہ انفرادی انتشاری تصور ہم نہیں اپنا سکتے، جو اس دورِ انحطاط

میں ہم پر مسلط ہو گیا تھا کہ اس سے تو وجود ملت ہی مٹ جانے کا خطرہ ہے۔ ہم پھر اپنی ملی ہستی کی خالص دینی اور اخلاقی اساس کو دیکھنے اور سمجھنے لگے ہیں۔ ہمیں اپنی ملت کے انسانی اور عالمی فرائض کا بھی کچھ کچھ دھیان

پھر آنے لگا ہے اور کانوں اور دلوں تک شہداء علی الناس کے مرتبے اور ذمہ داریوں کی یاد دلانے والی آوازیں اور بار پانے لگی ہیں۔ ہم دین کی خارجی رسمیت کی جگہ اس کی تخلیقی اور تنویری قوت کی طرف بھی آنکھ اٹھانے لگے ہیں جو ساری زندگی پر حاوی ہو کر اسے بامقصد اور بامعنی بناتی اور کل زندگی، کل کائنات، میں ہمیں ہماری حیثیت اور جگہ بتاتی ہے۔ ایک ایسی دنیا جو نسل وطن اور دولت کی تفریقوں سے انسانیت کے لئے جہنم بن گئی ہے پھر ہم سے اس حقیقی عدل و مساوات کی فرماں روائی کا پیام سننے اور اس کا عملی تجربہ دیکھنے کے لئے بیتاب ہے جو ایک اُمی نبیؐ نے دنیا کو سُنایا اور دکھایا تھا۔ کیا ملّتِ اسلامی اس تقدیر، اس موقع اور اِس ذمہ داری کو دو روٹیوں کے بدلے بیچ دے گی؟

ہندوستانی مسلمان

میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانانِ ہند کا مقام ہندی قوم میں آج ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمان آبادیاں دنیا میں بہت ہیں کہیں خدا کے فضل سے وہ اپنی زندگی کی تشکیل میں خود مختار ہیں، کہیں دوسروں کے زیر اقتدار آزادی سے محروم۔ مسلمانانِ ہند کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ کسی کے زیر اقتدار نہیں۔ لیکن تنہا اقتدار بھی نہیں رکھتے ہیں! یہاں کی آبادی مختلف مذاہب، مسالک، مختلف السنہ اور مختلف تاریخی وتمدنی عناصر پر مشتمل ہے! اسلام کی جو حیثیت عالمی زندگی میں ہونی چاہیئے مسلمانوں کی وہی ہندوستانی زندگی میں ہے۔ جس طرح دنیا میں مسلمانوں کو اپنے سے مختلف اعمال واعتقاد رکھنے والوں کے ساتھ زندگی گزارنی ہے اور اپنی مثال، اپنے افکار کی بلندی، اپنے کردار کی خوبی سے ایک صالح اور صحت مند زندگی کا نمونہ دوسروں کے سامنے پیش کرنا ہے اِسی طرح مسلمانانِ ہند پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ مشترک اور مختلف العناصر ہندی قوم میں حیاتِ طیبہ اسلامیہ کا ایسا نمونہ پیش کریں جس سے اُن کے ہموطنوں کے دل میں ان کے دین کے لئے جگہ پیدا ہو۔

داڑھی

مسلمانوں کو داڑھی رکھنی چاہئے۔ میں تمہیں مجبور نہیں کرتا کہ تم داڑھی رکھو لیکن یہ ذرا غور کرو آخر داڑھی منڈانے سے کیا فائدہ ہے؟ کیا داڑھی سے صورت بدنما ہو جاتی ہے؟ تم نے شاید داڑھی منڈوں سے مقابلہ نہیں کیا۔ کیا تم نے مغل بادشاہوں کی تصویریں نہیں دیکھیں؟ ان کی داڑھیاں بدنما ہوتی ہیں؟ آخر تم نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ داڑھی رکھ کر آدمی بدصورت ہو جاتا ہے۔ داڑھی میں ایک خاص حسن ہے۔ مرد اس سے مرد معلوم ہوتا ہے۔ تم لوگ سروں پر انگریزی بال رکھتے ہو، بلا سوچے سمجھے ؛ بال میں بھی رکھتا ہوں۔ میں نہیں کہتا تم بال مت رکھو۔ تم بال خوبصورتی کے لئے رکھتے ہو لیکن جب بالوں کا خشکی سے برا حال ہو، کپڑے میلے ہوں، جوتیاں گندی ہوں، تو ان بالوں سے کیا خوبصورتی ہو جائے گی۔ اور خوبصورتی تو ساری تندرستی اور صحت کی ہے۔ جن کی تندرستیاں اچھی ہیں ان کے چہرے بارونق ہوتے ہیں، وہ بال رکھیں نہ رکھیں خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ جن کی تندرستیاں خراب ہیں، چہرے زرد ہیں، ہڈیاں نکلی ہوتی ہیں، وہ ہزار بال رکھیں بدصورت ہی معلوم ہوں گے۔ تندرست آدمی کا چہرہ سیب کی طرح ہوتا ہے، اور آپ لوگ تو چھوہارے بنے ہوئے ہیں۔

.... خوددار قومیں تو غیروں کی اچھی چیز بھی لینے سے گریز کرتی ہیں، اور خاص کر ان قوموں کی جن کی وہ غلام ہوں۔ مگر آپ کی ذہنیت خدا نے ایسی خراب کی ہے کہ انگریز کی ہر چیز خواہ بری ہو یا بھلی جان دیتے ہیں۔ کیا تمہیں اچھا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے چہرے پر انگریزوں کی غلامی کی مہریں لگی ہوئی ہوں؟

نماز

تم لوگ نماز کو بھی ایک بار سمجھتے ہو، اور پھر کہتے ہو ہمیں نماز کے معاملہ میں مجبور نہ کیا جائے۔ ہم نے تم سے کوئی درخواست نہیں کی تھی، کوئی زور نہیں ڈالا تھا، نہیں آریہ سماج سے مسلمان نہیں بنایا۔ تم نے خود آکر یہ دعویٰ کیا کہ ہم مسلمان ہیں۔ پھر

اگر میں تمھیں مجبور کرتا ہوں کہ اسلام کے احکام کی پابندی کرو تو اس میں میرا کیا قصور؟ تم نے اور تمہارے سرپرستوں نے ہمیں یقین دلایا کہ تم مسلمان ہو۔ پھر بتاؤ میں تمہیں کیسے چھوڑ دوں .... اور دیکھو، تمہارا اس طرح اعتبار باقی نہیں رہتا۔ جو شخص کہے کچھ اور کرے کچھ، اس کا کون اعتبار کرے گا! تم کہتے تو یہ ہو کہ ہم مسلمان ہیں۔ اور جب ہم کہتے ہیں مسلمانوں کے سے کام کرو تو تم کرتے نہیں، اور ہمیں سختی اور جبر کا الزام دیتے ہو.... جب تم خدا اور رسول کے معاملہ میں جھوٹ بولتے ہو تو کسی انسان کے معاملے میں کیا سچ بولوگے؟ جب خدا اور رسول کو دھوکا دیتے ہو تو کون ایسا احمق ہے جو تم پر اعتبار کرے گا؟

نماز ایک پابندی ہے اور پابندی سے انسان کی عادتیں بنتی ہیں، اس کی سیرت کی تعمیر ہوتی ہے .... یہی فائدہ دوسری پابندیوں سے بھی ہو سکتا ہے۔ لوگ اپنے اوپر مختلف قسم کی پابندیاں عاید کر لیتے ہیں، کوئی کھیل کی، کوئی مطالعہ کی، کوئی چلنے کی۔ مگر ہوتی ہیں سب پابندیاں، جن پر انھیں اپنے نفس سے جنگ کرنی پڑتی ہے۔ لیکن تمہارے یہاں تو بنا بنایا اصول موجود ہے، تمہیں کسی نئے نظام کی ضرورت نہیں۔ اور اس میں دو فائدے ہیں۔ ایک فائدہ تو تمہاری سیرت بنتی ہے، دوسری طرف خدا اور رسول کی خوشی پوری ہوتی ہے....

لباس

تم لوگوں کی وضع آج کل عجیب سی ہو گئی ہے۔ چوڑے چوڑے پاجامے، چھوٹا سا کوٹ، اور کوٹ سے لمبا کرتا، پھٹی جوتی، ننگا سر، سمجھ میں نہیں آتا کیا فیشن ہے۔ نہ انگریزی نہ ہندوستانی، نہ مسلمانوں کا لباس ہے نہ ہندوؤں کا۔ آخر یہ کیا معجون مرکب ہے۔ ساری چیزیں انمل بے جوڑ۔ یہ بھی نہیں کہ سب یکساں ہوں، بھانت بھانت کی شکلیں ہیں۔ آکسفورڈ کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ وہاں کا طالب علم اپنی چال سے پہچان لیا جاتا ہے، اس کی چال میں غرور اور گھمنڈ ہوتا ہے۔ مطلب یہ نہیں کہ گھمنڈ کوئی اچھی چیز ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان میں کوئی خصوصیت ہے تو سہی۔ بھئی جامعہ اسلامی ادارہ ہے مسلمان پڑھتے ہیں، مسلمان پڑھاتے ہیں۔ دوسری درسگاہوں کے مقابلہ میں اس کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ اس کے طالب علم میں بھی تو کوئی خصوصیت ہونی چاہیے۔ مسلمان کا ہندوستان میں ایک خاص لباس ہو گیا ہے وہ ہمیں پہننا چاہیے۔ اب آپ لوگوں کا حال یہ ہے کہ پہچاننا مشکل ہوتا ہے، پتہ نہیں چلتا کس قوم کے آدمی ہیں!

۷

علی گڈھ کی جامعہ ملیہ

عجیب زمانہ تھا وہ صاحبو۔ نشۂ جوانی سے سرمست نوجوانوں پر پہلی بار وہ مخلصانہ دینی کیفیت طاری تھی جس کا ایک لمحہ کبھی کبھی ساری زندگی کا رنگ بدل دیتا ہے یہ جرماتوں کے ڈر سے نمازیں پڑھنے والے راتوں کو روتے اور گڑ گڑاتے سنائی دیتے تھے۔ خود غرضیوں کی ہر وقت جکڑے رہنے والی زنجیریں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈھیلی ہو رہی ہیں ٹوٹ رہی ہیں ملازمتوں کے متلاشی سفارشوں کے لئے سرگرداں، اپنے پیٹ کے علاوہ اور سب حقیقتوں سے ناآشنا جوان بیتاب تھے کہ اپنے وجود کو وجودِ ملّی میں گم کر دیں اور اپنی ساری قوتوں کو اس کی خدمت کے لئے وقف کر دیں لیکن عمر بھر خود غرضی کی تکرار سے بے غرض کاموں کی مشق تو نہیں ہوتی۔ اس بے غرضی کا رخ کبھی جاذب توجہ ہنگاموں کی طرف گلوں میں جھولیاں ڈال کر نکل کھڑے ہونے کی طرف تقریروں کی طرف نئی نئی وضع کے لباسوں کی طرف ہی جاتا ہے خدا کا شکر ہے کہ چند نوجوانوں کے اصرار پر قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے اس وقت اس جوش اور خلوص کو پائدار کام میں لگانے کا فیصلہ کیا اور

مجھے وہ وقت یاد ہے اور میرے متعدد ساتھیوں کو بھی، جب علی گڈھ کالج کی مسجد میں ایک وجود مقدس، قید، جلا وطنی علالت، اور تفکرات ملی نے جس کی ہڈیاں پگھلا دی تھیں، جس کے چہرے کی زردی سے معلوم ہوتا تھا غم کی آنچ نے خون کا ایک ایک قطرہ خشک کر دیا ہے، لیکن جس کی روشن آنکھیں اس یقین کی غمازی کر رہی تھیں کہ اگرچہ سب کچھ بگڑا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن مردوں کی طرح ہمت کی جائے تو مددِ خداوندی سے بہت کچھ بن سکتا ہے، یہ وجودِ مقدس دیوار کا سہارا لئے بیٹھا ہے، ناتوانی کے باعث مجمع کو خطاب بھی نہیں کر سکتا اور اس کا پیام اس کے شاگرد رشید مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی سناتے ہیں۔ صاحبو! یاد رہے کہ وہ دیوار جس کا سہارا لئے بیٹھے تھے وہ خالی اینٹ، پتھر کی دیوار نہ تھی، وہ ایمان محکم اور اس ایمان کے نتیجہ یعنی ایک عظیم الشان ملی ماضی کی دیوار تھی۔ اور وہ ان نوجوانوں کو مخاطب نہ فرما رہے تھے جو ان کے سامنے تھے، ان کا روئے سخن قوم کی ساری آنے والی نسلوں کی طرف تھا۔ اس وقت کسی بڑے مکان کا سنگِ بنیاد نہیں رکھا گیا تھا کسی عمارت کا افتتاح نہ ہو سکتا تھا۔ چندوں کا اعلان بھی نہ ہوا تھا کہ یہ قافلہ سر و سامان چھوڑ کر بے سر و سامانی کی طرف رواں ہو رہا تھا وقتی فائدوں کے بدلے وقتی نقصان کا سودا کر رہا تھا۔ اسے عاجلہ کے مقابلے میں آخرہ زیادہ عزیز تھی۔ وہ محنت اور مشقت کا عزم لے کر تعمیر نو کے لئے نکلا تھا اور اس کی کلفتوں اور محنتوں کو دوسری سہولتوں اور تن آسانیوں سے زیادہ عزیز رکھنا چاہتا تھا یوں اور اس فضا میں جامعہ ملیہ کا کام شروع ہوا تھا، ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو۔

جامعہ کا مقصد

جامعہ ملیہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے جس کا مرکز مذہب اسلام ہو، اور اس میں ہندستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے۔ اس کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ مذہب کی سچی تعلیم ہندوستانی مسلمانوں کو وطن کی محبت اور قومی اتحاد کا سبق دے گی، اور ہندوستان کی آزادی اور ترقی میں حصہ لینے پر آمادہ کرے گی؛ اور آزاد ہندوستان اور ملکوں کے ساتھ مل کر دنیا کی زندگی میں شرکت اور امن و تہذیب کی مفید خدمت کرے گا!

جامعہ کے بچوں کے نام

ہمارے بچو! خوش رہو اور تندرست!

تم جانتے ہو اس پرچے میں کیا خاص بات ہے یہ بات ہے کہ ۲۹ اکتوبر کو سب "پیام" بھائیوں کو ملے گا اور اب ۲۵ سال ہوئے اسی تاریخ کو جامعہ ملیہ کا کام پہلے پہل شروع ہوا تھا، تم میں سے اکثر تو اس وقت پیدا بھی نہ ہوئے تھے بہت سے چھوٹے لڑکے جو شروع میں جامعہ آئے تھے وہ اب خدا کے فضل سے جوان ہیں۔ بہت سے دور دور کے ملکوں سے علم سیکھ سیکھ کر واپس آگئے ہیں۔ بہت سے یہیں تعلیم ختم کر کے اپنی قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ مدرسے میں بچوں کو پڑھا کر لائق اور نیک بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اچھے اچھے اخبار اور رسالے نکال کر لوگوں کو سچی خبریں دیتے ہیں اور اچھی باتیں بتاتے ہیں۔ بعض تجارت میں روپیہ کما رہے ہیں اور اس کمائی سے دوسروں کی مدد بھی کرتے ہیں۔ یوں تو یہ اپنے اپنے دھندے میں لگے ہیں مگر جامعہ کا دھیان سب کو ہے جامعہ

ان سب کو پیاری ہے اور یہ سب جہاں بھی ہیں جامعہ کی مدد کر رہے ہیں۔
ذرا سوچو تو سہی کیوں؟ یہ اس جامعہ کو کیوں پیار کرتے ہیں۔ جہاں کا کھانا انھیں پھیکا سیٹھا معلوم ہوتا تھا۔ جہاں صبح صبح اندھیرے منھ اٹھنا، وضو کرنا اور نماز پڑھنا، پھر کٹاکٹی کے جاڑوں میں ورزش کے لئے میدان میں جانا انھیں کیسا کھلتا تھا۔ جہاں ان کے رہنے کو اچھے اچھے عالیشان مکان بھی نہ تھے مدرسے میں بیٹھنے کو میز کرسیاں بھی نہ تھیں جہاں نہ بہت آرام تھا نہ بہت ٹھاٹھ۔ یہ جامعہ کیوں انھیں اتنی پیاری ہے۔

اس لیے پیاری ہے کہ اس نے انھیں آدمی بنایا، ان کے دل میں پاک زندگی کی لگن لگائی اور ڈرا ڈرا کر نہیں بلکہ محبت سے ان کے دل میں خدا رسول کی محبت ڈالی۔ ان کے سینوں میں اپنے بھائیوں کی خدمت کا دلولہ پیدا کیا۔ اس نے انھیں سکھایا کہ جہاں رہو، جو کچھ کرو، سچائی کو ہاتھ سے نہ دو، اس راستے میں مشکلیں سامنے آئیں تو منہ مت موڑو، خود سختیاں اٹھاؤ اور دوسروں کے لئے آسانیاں پیدا کرو، تن بدن موٹے کپڑے سے ڈھانپ لو، روکھا پھیکا کھا کر گذر کر لو، مگر دماغ اونچے سے اونچے خیال سوچ سکے اور دل اچھی سے اچھی آرزوؤں سے بھرا ہو۔ پھر یہ اس کو جتنا پیار کریں کم ہے۔

پیارے بچو! یہ جامعہ تمہیں بھی یہی سکھانا چاہتی ہے۔ اور یقین ہے تم یہ سب کچھ سیکھ جاؤگے تو یہاں کی تکلیفیں یاد کر کر کے بھی مزے لوگے اور ان کی شکایت تمہاری زبان پر نہ آئے گی۔ تم سچے ہوگے، اچھے ہوگے، تندرست ہوگے، صاف ستھرے ہوگے، دیانت دار ہوگے، وطن کے سچے ہوگے، بروں کے لئے لوہا ہوگے، اچھوں کے لئے موم، غریبوں کا سہارا ہوگے، بے کسوں کا آسرا، سوتوں کو جگاؤگے، ڈوبتوں کو تیراؤگے۔ غریب ہوگے تو بھی سیر چشم، دوسروں کی دولت کو منہ پھیر کر نہ دیکھوگے، امیر ہوگے تو اپنی دولت کو خدا کی امانت سمجھوگے اور اس کے بندوں کی سیوا میں صرف کروگے۔ تم جہاں بھی ہوگے اپنے ساتھیوں کے لئے پڑوسیوں کے لئے بستی کے لئے رحمت ہوگے کہ تم اس کے نام لیوا ہو جو سارے جہانوں کے لئے رحمت ہے۔

اس وقت جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، ہم سب جو اس وقت تمہارے لئے تھوڑا بہت کام کر رہے ہیں، بوڑھے ہوں گے یا مر چکے ہوں گے، ہم چاہتے

ہوں گے یا مر گئے ہوں ، اگر تم اچھے ہوگے تو ہماری سب محنت ٹھکانے لگ جائے گی ۔

اس جامعہ کو بھی تمہیں میں سے بعض چلاتے ہوں گے ۔ اس وقت روپئے کی کمی نہ ہوگی ، کرائے کی عمارتیں نہ ہوں گی ۔ تعلیمی سامان کی کمی نہ ہوگی ۔ کتب خانے میں نہ جانے کتنی کتابیں ہوں گی ۔ اس وقت ایک تعلیمی مرکز ہے ، اس وقت تمہاری کوششوں سے سارے ملک میں ان مرکزوں کا جال بچھا ہوگا ۔ اس ۲۹ر اکتوبر کو سارے ملک میں لاکھوں خوش تندرست بچے اور صاف ستھرے محنت مزدوری کر کے حلال کی روٹی کھانے والے جامعہ کے ہزاروں مرکزوں میں جلسے کریں گے ۔ میری جگہ پر تم میں سے کوئی پیام تعلیم میں لکھنے کے موقعہ پر کچھ لکھے گا تو ہندوستان کے ہر مسلمان گھر میں لوگ اسے شوق سے پڑھیں گے اس لئے کہ مدرسوں کے بچوں ہی پر موقوف نہیں ہر طرف تمہارے کام کا چرچا ہوگا ۔ تعلیم تمہارے ہاتھ میں ہوگی ۔ سیاست تمہارے اشارے پر چلے گی ۔ رائے عامہ پر تمہارا اثر ہوگا ۔ آج ہم کمزور ہیں ۔ اس وقت تم مضبوط ہوگے انشاء اللہ ہاں ، اس وقت یہ بات نہ بھول جانا کہ تمہاری ساری کامیابی اس لئے ہے کہ تم نے اور تمہارے اگلوں نے بے غرض خدمت کو اپنا شعار بنایا جو ٹھیک سمجھا وہ دل لگا کر کیا اور نتیجہ کو خدا پہ چھوڑا ۔

بات بہت بڑھ گئی ، بس اب رخصت ، جامعہ کو اور تمہیں یہ دن مبارک ہو ۔

جامعہ کا نشان

اس تاسیسی نمبر نکالنے کی وجہ تم جانتے ہی ہو۔ اسی ۲۹ر اکتوبر کو آج سے ۴۱ سال پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کام کی ابتدا مولانا محمود الحسن صاحب مرحوم مغفور کے پاک ہاتھوں سے ہوئی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس موقعہ پر تم سے اسی جامعہ کے متعلق کچھ کہوں۔

تم نے اس مدرسے کا نشان بھی کبھی دیکھا ہے؟ ضرور دیکھا ہوگا:۔ اس نشان کا مطلب بھی سمجھے؟

دیکھو اس میں سب سے اوپر ایک ستارہ ہے، جس میں لکھا ہے۔ اللہ اکبر۔ جب اندھیری رات میں غریب مسافر جنگل و بیابان میں سفر کرتے ہوئے راہ بھٹک جاتے ہیں، کوئی راہ بتانے والا نہیں ہوتا تو وہ ستاروں کو دیکھ کر راستہ نکال لیتے ہیں۔ جامعہ والوں کو راستہ بتانے والا ستارہ یہی اللہ اکبر کا ستارہ ہے، ان کی نظر اسی پر جمی ہے۔ یہی دنیا کی اندھیاری میں انھیں راستہ بتاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ جتاتا ہے کہ اللہ اکبر سب سے بڑا ہے۔ جس نے اس کے آگے سر جھکایا ہے اسی نے سچی زندگی کا پتہ پایا۔ اس کے سامنے جھک کر پھر یہ سر کسی اور کے سامنے کیسے جھک سکتا ہے۔

اس چمکتے ہوئے ہدایت کے تارے کے نیچے ایک کتاب ہے جس پر لکھا ہے: "عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ" یہ کتاب قرآن پاک ہے۔ اسی سے خدا نے اپنے بندوں کو اپنی مرضی کا پتہ دیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ کس طرح نیکی کر کے، آپس میں ایک دوسرے کو بھائی بھائی جان کر، غریب امیر کا فرق مٹا کر، رنگ روپ کی تمیز ہٹا کر، آقا اور غلام کی تقسیمیں اٹھا کر، اس کے بندے اچھے سچے بندے بن سکتے ہیں۔ اس کتاب نے آدمیوں کو تاریکی سے روشنی میں پہنچایا، اور جو راہ بھٹک گئے تھے انھیں راہ بتائی، اور اسی کے لانے والے نے اپنی پاک زندگی کی مثال سے، اپنی آنکھوں کی تاثیر اور دل کی گرمی سے، ایک گروہ ایسے نیک آدمیوں کا تیار کر دیا جس نے دنیا سے طرح طرح

کی برائیوں کو مٹایا اور اس میں خدا کی سچی حکومت اور آدمیوں کی سچی برادری قائم کی ۔

اس کتاب کے دونوں طرف کھجور کے دو پیڑ ہیں، یہ کیا ؟ یہ اس دیش کا نشان ہیں جہاں خدا کا آخری پیام لانے والا پیدا ہوا ۔ اس بنجر دھرتی کا نشان جس میں یوں تو کچھ اُگتا نہ تھا پر جہاں دین الٰہی کے پودے نے جڑ پکڑی ۔ جو لوگ ناموافق حالات سے اپنے کاموں میں گھبرا جاتے ہیں، ان کے لئے یہ درخت ڈھارس کا سامان ہیں کہ اس دیس سے جہاں ان کھجوروں کے سوا اور پھول بوٹا نام کو نہ تھا، ہدایت کے چشمے اُبل پڑے، جن سے دلوں کی بستیاں سیراب ہو گئیں ۔ پھر تم ظاہری حالات کو دیکھ کر کیوں تھڑدلے ہوتے ہو ۔

سب سے نیچے ایک نیلا سا ہلال ہے ۔ جس کے نیچے لکھا ہے جامعہ ملیہ اسلامیہ ۔ یہ ہلال چھوٹا سا ہے ۔ لیکن جیسے ہلال بڑھ کر چودھویں رات کا چاند بن جاتا ہے اسی طرح یہ جامعہ جس کے کام کی ابھی ابتدا ہے، انشاء اللہ بڑھ کر روشن چاند بنے گی اور دیکھنے والوں کی آنکھ کا نور اور دل کا سرور ہو گی ۔

مجھے یقین ہے کہ جامعہ کے سب بچے اور پیام تعلیم کے سب پڑھنے والے ان باتوں کو اپنے دل میں جگہ دیں گے جو جامعہ کے اس چھوٹے سے نشان میں چھپی ہوئی ہیں اور بڑے ہو کر ایسے اچھے آدمی بنیں گے ۔ کہ ان کی بھلائی سے خود ان کا، ان کے خاندان کا، ان کے دیس کا اور ساری انسانیت کا نام اُجاگر ہو گا ۔

بچو ! نیک بنو، نیکی کرو، جاگو اور جگاؤ، یہ نہ سمجھو کہ تم ان ننھے ننھے ہاتھوں سے کیا کر سکتے ہو ۔ ان ہاتھوں میں بڑا زور چھپا ہے ۔ اس زور کو آزماؤ اور اپنے لئے اور دوسروں کے لئے برکت کا سبب بن جاؤ ۔ بس، خدا حافظ !

اجمل خاں کی یادگار، جامعہ

جامعہ ملیہ ایک خاندان کی طرح ہے .... گزشتہ سال اس اس خاندان پر ایک بڑی مصیبت آئی وہ یہ کہ خاندان کا سرپرست مر گیا یعنی حکیم اجمل خاں مرحوم کا سایہ سر سے اُٹھ گیا ۔ ان کے اس انتقال سے ہمیں جتنا صدمہ ہونا چاہیئے تھا اس کا اندازہ آپ

کر سکتے ہیں - ہم بہت مشکلوں میں ہیں۔ حکیم صاحب باوجود اپنی ذاتی مصروفیتوں اور قومی و ملکی کاموں کے اتنا وقت پھر بھی نکال لیتے تھے کہ بلی ماران سے چل کر قرولباغ آئیں اور جامعہ کے چھوٹے بچوں سے باتیں کرنے میں اپنے قیمتی وقت کا ایک حصّہ صرف کریں۔

ہمارے ہندوستانی رہنماؤں میں حکیم صاحب ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ انھیں ہندستان کی ایک بڑی تعداد سے وہ مذاقی اور شخصی تعلقات تھے جو غالباً اور کسی کو حاصل نہیں ہیں۔ لیکن باوجود ان تعلقات کے اس قوم نے ان کی یادگار قائم رکھنے کے لئے کوئی سرگرمی نہیں دکھلائی - اس میں کچھ مانگنے والوں کا بھی قصور ہے۔ تعلیم گاہ کے لئے چندہ دینا فخر سمجھا جاتا تھا، لیکن ہماری گداگری نے اس پیشے کو ذلیل و رسوا کر دیا ہے - اب ہم نے خود اپنے گریبان میں منہ ڈالا، اور یہ عہد کیا ہے کہ چاہے جتنی تکلیفیں اٹھانی پڑیں، اس یادگار کو قائم رکھیں گے تا آنکہ قوم خود ہی اس کی طرف توجہ کرے - اس مقصد کے لئے "انجمن تعلیم ملی" کے نام سے ایک جماعت بنائی ہے - جس میں یہ شرط رکھی ہے کہ کوئی شخص ایک سو پچاس روپے ماہوار سے زیادہ کسی حالت میں نہ لے گا - اور اس کا کوئی رکن پچھتر روپے سے زیادہ نہیں لے گا۔

روپے دو ہی طرح سے وصول ہوتے ہیں، ایک ٹیکس سے دوسرے نذر سے - ہم سمجھتے ہیں کہ اپنے کام سے ہم اپنے کو اس بات کا مستحق بنائیں گے کہ قوم ہمیں نذر دے۔ ممکن ہے آپ لوگوں کو میری یہ باتیں غرور سے بھری ہوئی معلوم ہوں، لیکن میں بہت خاکسار واقع ہوا ہوں، اور اس وقت ایسا کہنے پر مجبور ہوں، امید ہے آپ معاف فرمائیں گے!

مستقل سرمایہ جامعہ کا نہ ہے اور نہ کبھی ہوگا - اس کا سرمایہ اس کے کارکنوں کی ہمت اور ایثار اور قوم کی عام ہمدردی ہے - ممکن ہے آپ اسے کافی نہ سمجھتے ہوں، مگر میرے نزدیک تو یہ بہ سرمایہ لازوال سرمایہ ہے - اگر جامعہ ملک اور قوم کی کسی ضرورت کو پورا نہیں کرتی تو وہ نہیں چلے گی اور نہ وہ اس کی مستحق ہوگی - لیکن اگر وہ کوئی مفید خدمت کر رہی ہے تو قانون قدرت اسے زندہ رکھے گا اور دنیا کی کوئی قوت اسے فنا نہیں کر سکے گی۔

پچیس سال بعد

جامعہ کی پچیسویں سال گرہ - کیا کیا خیال - کس کس کی یاد - کیسی کیسی ہمت شکن تنقیدیں ، اور کیسی کیسی ہمت افزا حمایتیں - بے وفائیوں اور وفاداریوں ، کم ہمتی اور استقامت ، خاصی کٹھن راہ پر تھک تھک کر تھم تھم کر رہ جانے اور پھر ایک دوسرے کو سہارا دے کر اس راہ پر قدم بڑھانے کی کتنی تصویریں ذہن کے سامنے گزر جاتی ہیں -

۲۵ برس ! لوگ اکثر کہہ دیتے ہیں کہ قوموں کی زندگی میں پچیس برس کیا ہوتے ہیں - ہاں سوئی ہوئی قوموں پر صدیاں بھی کسی ناقابلِ ذکر تصور کے ساتھ گزر جاتی ہیں - جن قوموں کو کچھ کرنا ہوتا ہے اُن کے لئے پچیس سال بھی بہت ہوتے ہیں - پچیس برس میں قومیں اپنی زندگی کا رخ بدل لیتی ہیں ، رحمت بن جاتی ہیں ، عذاب بن جاتی ہیں ....

۲۵ برس اور اتنا سا کام ! ہاں بہت کم کام ہے - بہت معمولی کام ہے - بظاہر بہت بے اثر سا کام ہے - لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے بڑے کاموں کا بیج ہے - جماعتی کاموں میں میرا گمان ہے کہ پہلے سے راہ کے جملہ نشیب و فراز سے آگاہ ہونا اتنا اہم نہیں جتنا کہ ساتھ مل کر چلنے والوں کا یکجا ہونا - توفیق الٰہی شاملِ حال ہو تو یہ راہ بھی دریافت کر لیتے ہیں - کسی نے خوب کہا ہے ؎

من از طریق نہ گویم رفیق می جویم
کہ گفتہ اند نخستیں رفیق و باز طریق

جہاں پچیس مہینے کام کو مل کر کرنے کی مثالیں کمیاب ہوں وہاں

پچیس برس آرام و آسائش میں نہیں تکلیف اور بے سرو سامانی میں جمے رہنا بالکل بے معنی بات نہیں۔ اس پر بہت فخر کرنے کا موقع بے شک نہیں اور نہ یہ خیال دل میں لانا چاہیے کہ اوروں سے کچھ نہ بن پڑا۔ (دوسرے کی کم ہمتی کو اپنے لئے معیار بنانا بڑی ہی کم ہمتی کی بات ہے۔ لیکن مایوس ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔

جامعہ میں خطبۂ تقسیم اسناد

جامعہ سے میرا اتنا پرانا اور قریبی تعلق ہے کہ اس وقت عجیب سا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا رسمی طور پر شکریہ ادا کروں کہ آپنے مجھے اس تقسیم اسناد کے موقع پر جامعہ کے استادوں اور طالب علموں کو خطاب کرنے کی دعوت دی۔ بہت دن آپ سے دور رہا ہوں۔ اس لئے آج بہت سی باتیں اگلے وقتوں کی یاد آتی ہیں پرانے ساتھی جانتے ہیں کہ وہ بڑا مشکل زمانہ تھا۔ مگر کچھ ایسا لگتا ہے کہ تنگی کے دن کچھ اچھے ہی دن تھے سامان نہیں تھا، ارمان تھے، دولت نہیں تھی ہمت تھی سامنے ایک آدرش تھا، دل میں ایک لگن تھی (اختیار مانگنے پر سکے دھیان تھا، اپنا کام پورا کرنے کی دھن تھی، تنخواہیں بڑھوانے کا موقع کہاں تھا، جان کھپانے میں جی سکھ پاتا تھا، ہر بچے جو اس بے سرو سامان بستی میں آجاتا تھا اس کی آنکھوں میں ہمیں آزادی کی چمک دکھائی دیتی تھی، ہم سے غلامی نے جو کچھ چھین لیا تھا وہ سب ہمیں ان بچوں میں مل جاتا تھا، ہر بچے میں ایک گاندھی۔ ایک اجمل خاں، ایک آروِند، ایک محمد علی، ایک نہرو، ایک وزبھاچیپا لگتا تھا۔ جس کام کے اپنے ہاتھوں پورا ہونے کی امید نہ تھی اس کی تکمیل کی ساری امیدیں ان بچوں سے

بندھی ہوئی تھیں۔ بڑا اچھا زمانہ تھا وہ دوستو! پھر آزادی آئی، بادل چھٹے سورج نکلا، پر چھٹتے چھٹتے وہ بادل خون برسا گئے۔ دیس بٹا، اس کے گلی کوچوں میں خون بہا، گھر گھر آنسو بہے، بھائی بھائی کا دشمن بنا لاکھوں گھر اجڑے، لاکھوں کاروبار برباد ہوئے، آزادی کی خوشی داغ داغ ہو گئی۔ آزادی کے ساتھ جو ولولے اور حوصلے اُبھرے وہ دبے دبے سے رہے۔ نیا ہندستان بنانے کے ارمان جو مدتوں سے دلوں کو گرما رہے تھے، کچھ ٹھنڈے سے پڑ گئے۔ نئی مصیبتیں سامنے آئیں ساری قوتیں ان کے دور کرنے میں لگانی پڑیں اور آزادی کے پہلے دن میں جو بہت سا کام ہو جاتا، وہ ہو نہ پایا پر وہ وقت بھی بیت گیا، وقت کی بڑی خوبی یہ ہے کہ بیت جاتا ہے۔ اس ہنگامے میں جامعہ پر بھی نئی مشکلیں گزریں۔ پر وہ بھی گزر گئیں اور خدا کا شکر ہے کہ آج تعمیر قومی کا یہ کام اچھے ہاتھوں سے اچھی طرح انجام پا رہا ہے۔ اس کا افسوس ہے کہ میں اس طرح آپ کا ہاتھ نہیں بٹا رہا ہوں جیسے آپ سب نے میرا ہاتھ بٹایا تھا۔ پھر بھی آپ کو یہ بتانا ضروری نہیں سمجھتا ہوں کہ میں اب بھی آپ ہی میں سے ہوں اور قوم کی جو خدمت مجھ سے ہو سکتی ہے اسی جذبے کے ماتحت کر رہا ہوں جس نے مجھے جامعہ کی خدمت کرنے کی توفیق دی۔ دراصل جامعہ نے قومی تعلیم اور قومی زندگی کی تعمیر کا جو نصب العین پیش کیا ہے اس میں ہر قسم کی خدمت شامل ہے، اور اگر اس وقت آپ نے مجھے امیر جامعہ کی آرائشی کرسی پر بٹھا دیا ہے اور میرا فرض منصبی کچھ اور ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ جامعہ کے نصب العین سے میرا تعلق کچھ کم ہو گیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہر شخص کو جس کے دل میں خدمت کا جذبہ ہے کوئی کام جس کا وہ اہل ہو ضرور کرنا چاہیے اور اگر وہ مفید ثابت ہو تو بھی کسی مناسب

وقت پر چھوڑ دینا چاہیئے کہ دوسرے اسے سنبھالیں اور اپنے ذوق کے مطابق ترقی دیں۔ میں اسے جامعہ کی افادیت اور اس کے استحکام کی ایک دلیل سمجھتا ہوں کہ میں جامعہ کے باہر ایک عہدے کو قبول کر سکا اس اطمینان کے ساتھ کہ جامعہ کے سب کام بدستور چلتے رہیں گے۔ شیخ الجامعہ صاحب کی رپورٹ سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ میرا اندازہ صحیح تھا، جامعہ کے سب کام چلتے رہے ہیں، اور اس سے زیادہ حوصلہ افزا یہ بات ہے کہ قومی ضرورت کا وہ احساس جس کی بدولت جامعہ قائم ہوئی تھی اب بھی اسی طرح سے کارفرما ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جو نئے کام شروع ہوئے وہ جامعہ کے کسی استاد یا کارکن کے شوق اور ہمت کی بدولت شروع ہوئے، اور ان کاموں نے خود اپنے وسائل پیدا کئے۔ عام طور پر لوگ یہ سوچتے ہیں کہ پہلے کوئی اسکیم ہونا چاہیے، پھر اس اسکیم کا بجٹ بننا چاہیئے جس میں اچھا کام کرنے والوں کی قابلیت کے لحاظ سے تنخواہیں شامل ہوں۔ اور جب اسکیم اور وسائل کو منظور کرنے والے اسے منظور کر لیں تو پھر ان آدمیوں کو تنخواہ کا اشتہار دے کر جمع کرنا چاہیئے جو اس اسکیم کو عمل میں لا سکیں۔ اس میں کام کی لگن یعنی وہی چیز جو اس میں جان ڈالتی ہے نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے، اور اکثر نظر سے اوجھل رہتی بھی ہے۔ ہم نے جامعہ میں پہلے دن سے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس میں پہلی شرط کام کی لگن ہے، جو آدمی میں ہوتی ہے، اسکیم میں نہیں ہوتی لیکن لگن کو ثابت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اس لئے کہ کسی نہ کسی منزل پہ وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وسائل فراہم کرنے والے بجٹ کو دیکھتے ہیں آدمی کو نہیں دیکھتے۔ ٹالتے ہیں، سودا کرتے ہیں۔

کام کے ساتھ صبر بھی جامعہ والوں کی ایک بنیادی خصوصیت ہے۔ آپ اس کا بالکل خیال نہ کریں کہ جامعہ کے کام ملکی زندگی کے پھیلاؤ کے ساتھ نہیں پھیلے۔

جامعہ کی آبادی ملک کی آبادی کے ساتھ نہیں بڑھی۔ کم کم دینا دیر دیر سے دینا بھی خدا کی ایک مصلحت ہے جس کا راز سمجھنا پورا آدمی بننے اور پورے آدمی کا کام کرنے کے لئے بہت ضروری ہے۔

میں اسے جامعہ والوں کی بڑی کامیابی سمجھتا ہوں کہ وہ بغیر کسی پس وپیش کے، بلکہ قدرتی طریقے پر، جیسے بڑھتا ہوا درخت اپنے سائے کو پھیلاتا ہے، اپنی ذمے داریوں کو بڑھاتے رہے۔ اس وقت قوم کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ لوگوں کے دل خوف اور تعصّب سے پاک ہوں اور وہ خاموشی کے ساتھ صحیح بات کہتے اور صحیح کام کرتے رہیں۔ دل خوف اور تعصب سے پاک ہوتے ہیں، کرائے نہیں جاتے۔ اور وہ پاک ہوتے ہیں دوسروں کی صفائی سے اثر لے کر۔ ہندوؤں، سکھوں، اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور بھائی دوست اور ساتھی بنانے کا وہی طریقہ صحیح اور کارآمد ہوسکتا ہے جو جامعہ نے اختیار کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب شرنارتھی نہیں رہے، اب وہ ضرورت مند ہونے کے بجائے خود دوسروں کی ضرورتیں پوری کر سکتے ہیں، لیکن دل کی صفائی کی تڑپ اور تلاش صرف مصیبت کے وقت نہیں ہوتی، ہمیشہ رہتی ہے، اور مجھے یقین ہے کہ جامعہ والے اپنے مسلک پر قائم رہے تو ان کے اور تمام ملک والوں کے درمیان محبت اور اعتماد کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جائے گا۔

مجھے اس بات سے بہت خوشی ہوئی ہے کہ جامعہ نے اردو زبان کو دلوں کے ملانے کا ایک ذریعہ بنایا ہے۔ اردو زبان کو ایک تہذیب نے پیدا کیا جو سب کی تہذیب تھی، اس کے الفاظ اور بندشوں اور محاوروں کو ایک ذوق پرکھتا رہا جو بنیادی طور پر حسن کا ذوق ہے۔ مہذب آدمی دوسروں کو اپنی طرف کھینچتا ہے،

اپنے پاس سے بھگاتا نہیں ہے، مہذب زبان دوسری زبانوں اور ان زبانوں کے بولنے والوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے، ان کی خوبیوں سے اثر لے کر اپنی خامیوں کو دور کرتی ہے۔ جامعہ میں اردو ذریعۂ تعلیم ہے اور دفتری زبان ہے، لیکن شیخ الجامعہ کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اردو ملنسار ہے، مہمان نواز ہے، اپنی اور دوسروں کی خودداری کا پورا لحاظ کرتی ہے، دوسروں کی دوستی اور قدردانی کو اپنے حسن کا آئینہ بنا کر رکھتی ہے، حالات چاہے جتنے ناسازگار ہوں، مجھے یقین ہے کہ اردو نے اپنے تہذیبی معیار کو نہ چھوڑا تو اس کی ہر دل عزیزی بڑھتی جائے گی۔ جامعہ کے چار اردو مرکزوں کی طرح کے بہت سے مرکز قائم ہوں گے۔ یہ صرف کتب خانے نہ ہوں گے، بلکہ علم اور تہذیب کے مرکز بھی ہوں گے، اور لڑکیاں اور لڑکے صرف سولہ میل سے نہیں، بہت دور دور سے اردو زبان کے رس اور اس ذوق کی تلاش میں جامعہ آتے رہیں گے جس نے اردو زبان میں رس پیدا کیا ہے۔

آپ سب جانتے ہیں روپیہ نہ پہلے کبھی میرے اختیار میں تھا نہ آج اس پر کوئی اختیار ہے لیکن یہ جانتا ہوں کہ اچھے کام کرنے والوں کا کوئی اچھا کام روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے رکتا نہیں ہے۔ دیر تو ضرور ہو جاتی ہے کہ آزمائش کچھ سنت الٰہی کا اٹل سا جزو ہے۔ پر اپنے کام کو وسائل سے مستقل طور پر محروم کرنے میں مشیت کو بھی شرم سی آتی ہے۔ وسائل فراہم ہو ہی جاتے ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے وسائل بھی ضرور فراہم ہو جائیں گے۔ اور اگر ان کی فراہمی کے سلسلے میں مجھ سے کوئی خدمت ہو سکے گی تو اس کو اپنے لیے سعادت سمجھوں گا۔

میں جامعہ کی تعریف نہیں کرنا چاہتا، صرف آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں

کہ جامعہ کے قائم کرنے والے کون تھے اور یہ کن حوصلوں کے ساتھ قائم کی گئی تھی۔ مہاتما گاندھی کی آرزو تھی کہ ہندوستانیوں کی تعلیم ان کے اپنے ہاتھ میں ہو اور وہ انگریزوں کی نقل اور سرکاری ملازمت کے پھیر سے نکلیں۔ ہندوستان کی آزادی کی طرح ہندوستانیوں کا اتحاد بھی انھیں بہت عزیز تھا، اور وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان میں کم از کم ایک ادارہ ایسا ضرور ہو جہاں مسلمانوں کی تہذیب پر "سچی" قومیت کی بنیاد رکھی جائے۔ حکیم اجمل خاں جو اس وقت گاندھی جی کے سب سے ممتاز ساتھیوں میں سے تھے اور پہلے امیر جامعہ بنائے گئے ہندوستان کی مشترک تہذیب ہی نہیں بلکہ سچی تہذیب کا نمونہ تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم و مغفور کے متبرک ہاتھوں سے، کہ ایک مرد مجاہد، ایک مرد مومن کے ہاتھ تھے، اس کے کام کا آغاز ہوا۔ پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا آزاد بھی جامعہ کے بانیوں میں تھے، اور ان سب نے اپنے اپنے طور پر جامعہ والوں کو متاثر کیا۔ جامعہ کے استادوں کا یہ فرض ہے کہ وہ جامعہ کے اندر، اور آپ لوگوں کا، جو جامعہ سے سند لے کر جا رہے ہیں فرض ہے کہ جامعہ کے باہر اپنی گفتار اور کردار کے ذریعہ ان بزرگوں کی یاد تازہ کریں۔ ان کی نقل نہ کیجیے، اس لئے کہ نقل بگڑ بھی جاتی ہے اور اس کا اثر الٹا ہو سکتا ہے، ان کی مدد سے اپنی شخصیت کو سدھار اور سنوارئیے، جیسے پودے سورج کی روشنی سے مدد لے کر اپنے پھولوں میں رنگ اور خوشبو پیدا کرتے ہیں۔ آپ تہذیب کے، رواداری کے، بھائی چارے کے، علم اور علم دوستی کے سائے میں پلے ہیں۔ ان خوبیوں کے فیض کو دوسروں تک پہونچائیے اور اپنے آپ کو ہندوستانی شہریت کا خوب صورت نمونہ بنائیے۔

خدا آپ کو کامیاب کرے۔

نئی عمارتیں ــــ یا مقبرے

جب بھی ... کسی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جاتا ہے تو میرا دل تھرتھراتا ہے .... عمارتوں کی کثرت کسی ادارے کے لئے قابل فخر نہیں ہے۔ اکثر عمارتیں یا تو مقبرے ثابت ہوتی ہیں یا قید خانے! اگر عمارت میں رہنے والے اصل مقصد کو بھول جائیں تو وہ عمارتیں ان کے مقاصد اور ارادوں کا مقبرہ بن جاتی ہیں، اگر عمارتیں ہی مقصود بالذات بن جائیں تو وہ جیل خانہ ہیں جن سے حوصلوں، امنگوں اور ولولوں کو نکلنے کی راہ نہیں ملتی۔ جامعہ کی پہلی عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے وقت میں نے کہا تھا کہ کہیں ہم لوگ عظیم الشان اور فلک بوس عمارتوں میں بیٹھ کر اپنے مقاصد کو نہ بھول جائیں، اگر ہم ایسا کریں تو آئندہ آنے والی نسلوں کو یہ حق ہوگا کہ ہم کو ان عمارتوں سے دھکا دے کر نکال دیں اور ہمارے مقاصد اور ارادوں کے ان پر مقبروں کو گرا دیں۔ مجھے امید ہے جامعہ والے اس مقصد کو نہیں بھولیں گے۔

بڑی بڑی شاندار عمارتوں کے بنانے میں ہمیشہ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں تعلیم کی روح ان میں قید ہو کر نہ رہ جائے اور ساز و سامان کی فراوانی تعلیم گاہ کے نصب العین کو دبا کر فنا نہ کر دے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جامعہ کو چھوٹی چھوٹی کچی عمارتوں اور جھونپڑوں میں شروع کیا گیا تھا لیکن اس کے کارکنوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ اس مادی بے سروسامانی کی حالت میں بھی اس کی آزادی اور نصب العین کی بلندی کو قائم رکھا جائے۔ اگر ان نئی عمارتوں کے بننے سے یہ اندیشہ ہو کہ جامعہ اپنے نصب العین پر قائم نہ رہ سکے گی تو میں دعا کروں گا کہ یہ عمارتیں تیار ہونے سے پہلے ہی برباد ہو کر زمین میں مل جائیں!

(اوکھلے میں جامعہ کی عمارت کے سنگ بنیاد کے موقع پر)

۸۵

علی گڈھ

اس کے بنانے میں ہندی مسلمانوں کی بہت کچھ محبت، محنت، دولت اور بہت کچھ جوش اور خلوص کام آیا ہے - اگر یہ قومی زندگی میں وہ رتبہ حاصل کرے، جس کا میں، اور میں سمجھتا ہوں ہر مسلمان، آرزومند ہے تو اس ملک میں مسلمانوں کے لئے باشرف اور باعزت شہریت کی ضمانت ہوجائے، کہ جمہوریت میں امتیاز شرف خدمت اور خوبی ہی سے حاصل ہوتا ہے، اور انھیں سے قائم رہتا ہے .....

میرا تو یقین ہے کہ علی گڈھ کو قومی زندگی میں بڑا کام انجام دینا ہے... وہ کام ہندوستانی تدبّر اور ہندوستانی تعلیم دونوں کا بنیادی کام ہے یعنی ایک جمہوری ریاست میں ایک متحدہ قوم کی تعمیر کا کام اور اس کی زندگی میں چار کروڑ مسلمان شہریوں کا حصہ اور مقام۔ کتنا بڑا کام ہے، اور کیسا دلکش کام، یہ مختلف تمدنی اور تہذیبی عناصر کو باہم سمو کر ایک متوازن اور ہم آہنگ زندگی کی تعمیر کا کام جس میں ہر جزو دوسرے جزو کی رونق کو چمکائے اور ایک حسین و جمیل کل کی تشکیل میں مدد دے - ماضی کے سارے خزانوں

کو چاہے کہیں سے آئے ہوں ہر ہندوستانی کی مشترکہ میراث بنا دینا، کہ سب ہمارے ہی گمشدہ لعل ہیں، سب کو ایک مشترک ماضی سے مالا مال کرنا، سب کو مستقبل میں ایک جدوجہد کا ولولہ بخشنا، کوئی چھوٹا کام ہے؟ اس عزیز وطن کے ہر مسلمان شہری کے ذہن میں یہ یقین رچا دینا کہ ان کا دین اور ہندوستانی زندگی کو صالح بنانے میں ان کا منصب، یہ ان پر ذمہ داری کا ایک اور بوجھ ڈالتے ہیں، اور خدمت کا ایک نادر موقع پیش کرتے ہیں یہ بے وفائی یا بے اعتنائی کا بہانا نہیں ہیں - کچھ چھوٹا کام ہے یہ؟

علی گڈھ جس طرح کام کرے گا، علی گڈھ جس اسلوب پر سوچے گا، علی گڈھ ہندوستانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے خدمت کی جو پیشکش دے سکے گا، اس سے متعین ہوگا ہندوستانی قومی زندگی میں مسلمانوں کا مقام! اور ہندوستان جو سلوک علی گڈھ کے ساتھ کرے گا اس پر، ہاں اس پر، بڑی حد تک منحصر ہوگی وہ شکل جو ہماری قومی زندگی مستقبل میں اختیار کرے گی -

نیا علیگڑھ

جب دارالعلوم قائم ہوا تو وہ مسلمانان ہند کے لئے سخت ابتلا کا وقت تھا- غلامی کی زنجیریں پیروں میں ڈالی جا رہی تھیں، اور ایک تاریک دور کا آغاز تھا سیاسی غلامی سے زیادہ خطرناک چیز قوم کی اپنی اخلاقی و روحانی پستی تھی - ذہنی جمود اپنی حد کو پہنچ گیا تھا - قوم کے قوائے ذہنی و اخلاقی شل تھے، علم و دانش سے بیزاری تھی، اور سیرتِ حسنہ کا شیرازہ تار تار ہو چکا تھا - اس دورِ ابتلا میں اس پیر جواں ہمت سید احمد خانِ اعظم نے اس نیم مردہ قوم کو پھر سے تندرست و توانا بنانے، خوابِ غفلت میں سرشار قوم کو پھر سے بیدار کرنے کا قصد کیا- اسے سیاسی اقتدار واپس دلانے کی کوشش سے نہیں، بلکہ اس کے قوائے اخلاقی و ذہنی و روحانی کو فسردگی و فساد سے نکالنے اور صحت مند بنانے کی کوشش سے- اس نے کہا علم اور سیرۂ حسنہ پہ آئندہ قومی عظمت کی بنیاد رکھی جائے -

یہ بڑی ہمت کا کام تھا، بڑا صبر آزما کام تھا۔ اس کے انجام دینے میں غلطیاں بھی ہوئی ہوں گی۔ سب جانشینوں میں بانی کی سی فراست اور بانی کا سا خلوص نہ رہا ہو تو تعجب کی بات نہیں۔ مگر کام کی بنا خلوص اور نیک نیتی پر تھی، اس لئے باوجود وقتی لغزشوں کے یہ ادارہ اپنے بانی کے ارادوں کو پورا کرنے میں ساعی رہا۔ وطن کی آزادی میں اس کے تیار کئے ہوئے نوجوانوں اور بوڑھوں نے جو حصہ لیا وہ ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد لوگوں کو گمان تھا کہ اس ادارے کا مستقبل بڑے خطرے میں ہے، الحمد للہ، یہ خیال بالکل بے بنیاد نکلا۔ مسلمان ہند آج بھی دنیا کی تیسری بڑی مسلم آبادی ہیں، اور انھیں ایک آزاد جمہوریہ کے ذمہ دار شہری ہونے کا امتیاز و افتخار حاصل ہے، ان کی ترقی ہندوستان کی ترقی، ان کی بدحالی سارے ہندوستان کی بدحالی ہے۔ ان کے سپرد اپنے ملک کی خدمت کی ذمہ داری ہے، اور ملک پر ان کی فلاح و بہبود کی کوشش فرض ہے۔

آزادیٔ ہند کے بعد سے علی گڑھ کی روداد اسی حقیقت کی تفسیر ہے۔ گزشتہ عہد میں، جب علی گڑھ پر انگریزی حکومت کی خاص نظر التفات بتائی جاتی تھی، سالانہ ساڑھے تین لاکھ روپے کی امداد ملتی تھی؛ اور یہ مسلمانانِ ہند کی روح اور ان کے ضمیر کی قیمت تھی! کیسی ارزانی تھی اس جنس کی!! آزادیٔ ہند کے بعد سے حکومت ہند کی سالانہ امداد کا اوسط بیس لاکھ سے کم نہیں رہا ہے۔ نئے شعبوں کے کھولنے، نئے ساز و سامان کے فراہم کرنے، نئی عمارات کے بنوانے، کے لئے جو امداد ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔ اور، پچھلے سات سال سے زیادہ کے زمانے میں، جب سے میں وہاں ذمہ دار کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں، ایک واقعہ ایسا نہیں جب حکومت نے کسی معاملے میں کسی قسم کی مداخلت کی ہو، یا ہدایت دی ہو، یا اعتراض کیا ہو۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی بدخواہ نے حکومت سے کچھ کرنے کی خواہش کی ہے تو اس کو صاف جواب دیا گیا ہے یونیورسٹی ایک خود مختار ادارہ ہے.... حکومت اس کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتی....

یہ حال کسی غیروں کے ادارے کا نہیں ہو سکتا! مسلمانانِ ہند، ہندی قوم کا ایک اہم جزو ہیں۔ ان پر قومی زندگی کے تمام فرائض عائد ہوتے ہیں، اور قوم سے اپنی

ترقی و بہبودی کے وسائل لینے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ آپ خوش ہوں گے کہ یہ فرض بھی پورا ہو رہا ہے اور یہ حق بھی ادا کیا جا رہا ہے!

وقت گزر جاتا ہے

اس ادارہ کی تاریخ ایک بڑی ذہنی تحریک کی تاریخ ہے۔ جمود ذہنی کو دور کر کے بیداری فکر کا ایک نیا دور شروع کرنے کی داستان ہے۔ نامساعد و ناموافق حالات میں خلوص نیت اور سعی پیہم کی کامیابی کی کہانی ہے۔ ایک صحیح بنیادی خیال کے ارتقائی سفر کی روداد ہے کہ اگر اسے سچے اور مستعد حامل مل جائیں تو وہ کیسے برابر آگے بڑھتا ہے اور کیسے نئی نئی تشکیلات میں اپنے کو پورا کرتا ہے کیسے اس کے اس سفر میں کبھی کبھی غلط اور غیر ضروری عوارض دامن گیر ہوتے ہیں اور اسے اپنے مطالبوں کے تابع بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ کسی طرح اپنا دامن بچا کر نہیں گزر سکتا تو رفتہ رفتہ کس طرح اسے چھڑا کر اپنی منزل پر رشتا ہر راہ پر گامزن ہوتا ہے۔

ایک ایسے زمانہ میں کہ روایت کی غلط پاسداری جمود کامل کا رنگ اختیار کر چکی تھی، پرانے نظام جماعتی کی بنیادیں دھنس رہی تھیں، تعصب اور ہٹ پر ایک نئی زندگی کی تعمیر نا ممکن تھی۔ جدید علم کے خزانوں کے دروازے ایک دستک پر کھلنے کے لئے آمادہ تھے۔ اور ذہنی کاہلی تھی کہ ادھر قدم نہ بڑھانے دیتی تھی، انتشار جماعتی میں انفرادی اغراض نے جماعتی مصالح پر غلبہ پا لیا تھا، اور سربلندیاں اور ساری فضیلتیں خود غرضیوں کی خدمت گزار اور معاون سمجھی جاتی تھیں، صالح فرد کے لئے صالح جماعتی زندگی کی ناگزیری کا احساس مفقود ہو گیا تھا، حوصلے پست تھے، ہمتیں شکستہ تھیں، توانائیاں مضمحل تھیں۔
ایک پیر جواں ہمت سید احمد خاں نے احیاء ملت کا تہیہ کیا اور اپنی کوششوں کا مرکز ایک تعلیمی ادارہ کو بنایا۔ ایک بہت چھوٹے سے تعلیمی ادارہ کو۔ ہوتے ہوتے یہ پودا بڑھا اس کی اقامت گاہوں کی سارے ملک میں آسانی سے نظیر نہ ملتی تھی۔ اس کے کھلاڑیوں نے نام پیدا کیا، اس کے طلباء کے چال چلن، سلیقہ مندی، معاملہ فہمی کی شہرت عام ہو گئی علیگڑھ کا طالب علم اپنی سج دھج، اپنے طور طریقہ سے سارے ملک میں پہچان لیا جاتا تھا۔ اس تعلیم گاہ کے کام میں ملک کے سیاسی حالات نے، حکمراں قوم کی مخصوص مصلحتوں نے رخنے ڈالے، پیچیدگیاں

پیدا کیں اور اس کی ڈگر عام شاہراہ سے الگ ہو گئی۔ لیکن اسی ادارہ کے طالب علم تھے جنہوں نے ۱۹۲۰ء کی سیاسی آزادی کی تحریک کو اپنی ان تھک اور بے لوث کوششوں سے وہ توانائی بخشی جو تحریک آزادی ہند میں آخری منازل تک کسی نہ کسی روپ میں کارفرما رہی۔ اس زمانہ میں کالج یونیورسٹی کے درجہ کو پہنچا۔ اور اسی زمانہ میں اس سے الگ ہو کر مگر اس کی اصلی روح کو اپنے اندر لئے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کام شروع ہوا، جس نے ملک کے تعلیمی فکر پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ یونیورسٹی ابتدائی انتشاری دشواریوں کے بعد برابر بڑھتی گئی نئے نئے شعبے کھلتے گئے، مصارف بڑھتے گئے، طلباء کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا حتیٰ کہ ۱۹۴۷ء میں اعلان آزادی اور تقسیم ملک سے پہلے طلباء کی تعداد اور تعلیمی و تربیتی انتظامات میں ایک ناموافق نسبت پیدا ہو گئی تھی جس کا اثر کام کے معیار پر بہت مضر پڑا۔ یوں بھی سیاسی بحران کا زمانہ تھا اور یونیورسٹی کے لئے بڑا نازک زمانہ تھا۔ تقسیم کے بعد

اس کے جو نتائج رونما ہونے لگے وہ ایسے تھے کہ لوگ اس دارالعلوم کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو چلے تھے۔ اس کے وجود کے قائم رہنے کو مشتبہ سمجھا جانے لگا تھا۔ طلباء کی تعداد یکایک کم ہو گئی تھی بہت سے اساتذہ پاکستان چلے گئے تھے۔ مالی امداد کے وسائل کم ہو گئے تھے۔ فیسوں کی آمدنی گھٹ گئی تھی۔ عطیوں سے آمدنی ختم ہو چکی تھی۔ اور یونیورسٹی مجبور ہو گئی تھی کہ پچھلی خوشحالی کے زمانہ میں جو کچھ پس انداز جمع کیا تھا اسے کام میں لے آئے لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ وقت بھی گزر گیا۔ وقت کی بڑی خوبیوں میں سے یہ بھی ہے کہ گزر جاتا ہے۔ اور آج اگر ہم (پچھلے برسوں پر) نظر ڈالیں تو مایوسی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

علی گڈھ کے طلبا کی یونین میں الوداعی تقریر

جناب صدر اور عزیزو!

سب سے پہلے میں اپنے اس تامل کا اقرار کر لوں جو مجھے یہاں آنے میں تھا۔ میں آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا لیکن میں اس لئے آ گیا کہ میرے نہ آنے سے کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے۔ دراصل مجھے آنے میں تامل اس لئے ہوا تھا کہ میں اپنے اس رنج اور مایوسی کا اظہار آپ کے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا جو مجھے آپ کے رویّہ سے ہوئی۔ میں اس لئے مایوس ہوں کہ آپ میں اکثر

تک پختگی نہیں آئی، کوئی بھی شخص آپ کو آکر بہکا سکتا ہے۔ آپ ان بھیڑوں کی طرح جنھیں کوئی بھی گلہ بان ہانک لے جا سکتا ہے (، آپ کو کوئی بھی جوش دلاکر آپ کے جذبات بھڑکا سکتا ہے اور آپ نے اپنے جذبات کے سلسلہ میں عقل سے کام لینا ابھی تک نہیں سیکھا۔)

آپ آزاد ہیں، آپ کا یہ ادارہ آزاد ہے، لیکن آپ آزادی کی قیمت دینا نہیں جانتے۔

آزادی کی قیمت ہوتی ہے اس کے لئے مسلسل جدوجہد کرنا، آزادی کا حاصل کرنا جتنا مشکل ہے اس سے زیادہ مشکل ہے اس کا قائم رکھنا۔ آزادی روز حاصل کی جاتی ہے اس کے لئے ہر روز اس کی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے، آپ ہر روز کوئی نہ کوئی ایسا کام کرتے ہیں جس سے آپ اس آزادی کے زیادہ مستحق یا نااہل قرار پاتے ہیں۔ آزادی کسی کے پاس ہمیشہ کے لئے نہیں آتی خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

آپ نے جو کچھ کیا، اس کے لئے یقیناً آپ کو افسوس ہوگا۔ ابھی آپ کے صدر نے کہا کہ مظاہرہ اور جلوس قسم کی چیزوں کو وہ گھٹیا درجہ کی بات سمجھتے ہیں مگر آپ نے یہ سب کچھ کیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سب کچھ آپ ہی نے کیا، آپ نے بغلیں بجائیں دوسرے ننگے ہوکر ناچے، آپ نے جنازہ نکالا دوسروں نے قتل کر ڈالے۔ اگر آپکے خلاف کوئی شخص کوئی بات کہدے تو ذرا سی دیر میں آپ جوش میں ابل پڑ سکتے ہیں۔ کوئی بھی آپ کی سمجھ کو خرید سکتا ہے، آپکے جذبات کو بھڑکا سکتا ہے۔

آپ جلوس نکالیں، جلسوں میں گالیاں دیں، نعرے لگائیں، یہ سب آخر کیا ہے؟ یہ پڑھے لکھوں کی سی باتیں نہیں ہیں۔ عقلمند وہ ہے جو اپنے جذبات کو عقل کے قابو میں رکھے، جسے اپنے خلاف سن سکنے کی عادت ہو اور جو دوسروں کے اعتراضوں کا جواب ٹھنڈے دل سے دے سکے! آپ نے مسٹر منشی کا جنازہ نکالا، بعد میں آپ نے خود محسوس کیا ہوگا کہ یہ کوئی اچھی بات نہ تھی، ابھی کل ہی کی بات ہے آپ کے صدر انھیں بڑے احترام سے یہاں لائے تھے، انھیں یونین کا لائف ممبر بنایا تھا اور آج جتنی تعریف میری کی ہے اس سے زیادہ ان کی تعریف کی تھی — میں آپ کی تعریف پر کیسے اعتبار کروں، کون کہہ سکتا ہے کل آپ میرا جنازہ نہ نکالیں۔

گے ۔ آپ کی بات میں وقار ہونا چاہیئے اگر ایک مرتبہ کسی بات کو کہہ دیں وہ غلط بھی ہو تو اس کا پاس کرنا چاہیئے ۔

رسول اللہؐ پر کوئی اعتراض کرے تو اسے مردہ باد کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ عقل اور سوجھ بوجھ سے اس کے اعتراضات کا جواب دینا چاہیئے ۔ آپ کی اس درسگاہ کے بانی کے زمانے میں سر ولیم میور نے ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس نے رسول اللہؐ پر اعتراضات کئے تھے ، سرسید احمد خاں نے اپنا سارا اثاثہ بیچا ، اپنے گھر کے برتن بیچے اور لندن کے دور دراز سفر کے لئے نکل کھڑے ہوئے تاکہ وہاں پہنچکر سارے مواد کا مطالعہ کر کے ایک کتاب لکھ سکیں ، وہ بوڑھا آدمی تھا اتنا لمبا سفر کافی تکلیف دہ تھا وہ اس ملک کی زبان سے بھی ناواقف تھا ۔ لیکن وہ بوڑھا مجھ سے بڑا عاشقِ رسول تھا ۔ اس نے یہ سب کچھ برداشت کیا اور ایک ایسی کتاب لکھی جو رسول اللہؐ کے معترضین کے سامنے آج بھی پیش کی جا سکتی ہے ۔ خطبات احمدیہ ، رسول اللہ کی زندگی کے سلسلے میں آج بھی ایک معیاری کتاب مانی جاتی ہے ، اعتراض کا جواب ایسے دیا جاتا ہے !! اس نے کوئی نعرہ نہیں لگایا ، نہ کسی کا جنازہ نکالا نہ کسی کو مردہ باد کہا ۔ آپ نے مردہ باد کہا بھی تو اس سے کیا ہوا ۔ آپ کی بات میں اتنا وزن ہونا چاہیئے کہ جسے مردہ باد کہیں وہ مردہ ہو جائے ، جسے زندہ باد کہیں وہ زندہ ہو جائے ۔ آپ کا جو طریقہ تھا اس سے رسول اللہ کی روح کو تکلیف پہونچنی چاہیئے ۔ اور مجھے اس کا یقین ہے کہ انھیں تکلیف ہوئی ہوگی ۔

تم کچھ کرنے سے پہلے اپنے بڑوں سے مشورہ کیوں نہیں کر لیتے ۔ مشورہ لینے کا یہ مطلب نہیں کہ تم اس کے ماننے کے لئے بھی مجبور ہو ، لیکن اس سے تمہاری عقل ضرور صیقل ہو جائے گی ، سمجھ میں اضافہ ہوگا ۔ تم آزاد ہو ، استاد تمہیں ازخود تو مشورہ نہیں دے سکتے ۔ لیکن تمہیں مشورہ لینا چاہیئے ۔ جس طرح بوڑھوں کو سہارے کیلئے جوانوں کی ضرورت پڑتی ہے اسی طرح جوانوں کو بوڑھوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔

اس سلسلہ میں پریس میں جو غلط بیانی ہوئی تمہیں اس کا برا نہیں ماننا چاہیئے اس کی بھی کچھ وجوہات ہیں ، اس کا ذمہ دار یہاں کا ماضی ہے ، گذرے ہوئے زمانہ کی کچھ روایات ہیں ، ایک پوری تاریخ ہے ۔ ان غلط بیانیوں پر مشتعل ہونے کی ضرورت نہیں ۔ تمہیں صبر کرنا چاہیئے ، تم صبر کے لئے مجبور بھی ہو اور یہ تمہارا فخر بھی ہے ۔

مجھے تمہاری راہبری پر افسوس ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ یونین میں اچھے آدمیوں کو لاؤ۔ بیوقوفوں کو منتخب مت کرو۔ تقریریں سن کر غلط اور جذباتی فیصلہ کر ڈالنا پڑھے لکھوں کی شان کے خلاف ہے۔

اب جو کچھ ہو چکا، ہو چکا — آپ کو اس کا افسوس ہوگا، مجھے بھی افسوس ہے، میں بہر حال آپ کے ساتھ ہوں اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے اگر میرا ایک ہاتھ صحتمند نہ رہے تو دوسرے ہاتھ سے میں اسے کاٹ تو نہیں سکتا۔

یہ ۸ سال میں نے جس ولولہ اور خوشگوار انداز سے گذارے ہیں اس میں آپ کا بڑا ہاتھ ہے میں آپ کا شکر گذار ہوں۔ لیکن آخر میں آپ نے مجھے دودھ دیتے دیتے اس میں مکھی بھی ڈالدی۔

میری آرزو ہے کہ آپ ہندوستان کے اچھے شہری بنیں۔ آپ کا مقام زمین پر نہیں۔ درخت کی سب سے اونچی چوٹی پر ہے۔ جگہ تو چھت پر خالی ہوتی ہے۔ نیچے تو آدمی آلودگیوں، چھوٹی چھوٹی کشمکشوں اور معمولی مسئلوں میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ آپ کا عزم ہونا چاہیئے کہ آپ اپنی یونیورسٹی کو ہندوستان کی سب سے اچھی یونیورسٹی بنانے سے پہلے چین نہ لیں گے۔ خدا حافظ۔

ذاکر ببلیو گرافی

مرتبۂ

جمیل احمد قریشی

بی اے۔ ایس سی۔ (علیگ) ایم۔ اے (جامعہ)

جامعہ سینٹرل لائبریری نئی دہلی

یہ ببلوگرافی، جو جمیل قریشی صاحب کی کاوش کا نتیجہ ہے اس نوع کی پچھلی تمام کوششوں سے زیادہ جامع اور غالباً زیادہ مفید بھی ہے۔ جابجا ضروری اقتباسات دے کر اسے مزید دلچسپ اور کارآمد بنا دیا گیا ہے۔ چونکہ تمام تحریروں کو کچھ عنوانات کے تحت تقسیم کر لیا ہے، اس لیے کتابوں اور مقالوں میں کوئی مزید تفریق نہیں کی گئی ہے۔

گورنری تک تو خیر لیکن نائب صدارت اور پھر خاص کر صدارت کے زمانے میں ذاکر صاحب کے نام سے منسوب بہت سی موقعوں کی تقریریں، یادگاری اور آرائش کے تحت بعض کتابوں پر ثبت تقریظیں اور دیباچے اور بہت سے رسمی خط ہیں: یہ سب کے سب ذاکر صاحب کے لکھے ہوئے نہیں ہیں ـــ اس لیے انھیں اندراج کرنے میں احتیاط ضروری تھی؛ تاہم چونکہ اس مرحلہ پر عجلت یہ ممکن نہ تھا کہ چند کے سوا باقی تمام اس قسم کی تحریروں کا پتہ لگ جائے جو دوستوں، عزیزوں یا سکریٹریوں نے لکھ کر دیں اور ذاکر صاحب صرف انھیں پڑھنے کے گنہگار رہے ـــ اس لیے فی الحال انھیں درج تو سبھی کو کر لیا گیا ہے؛ رہا ان سے کسی سلسلہ میں استشہاد یا ان کے ذاتی عقیدہ، فکر، اسلوب یا شخصیت کے تجزیے کے لیے ان کا استعمال، تو جب تک پورے طور پر اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ وہ واقعی ذاکر صاحب ہی نے لکھی ہیں، اس وقت تک انھیں انکی نہیں سمجھنا چاہیے! ورنہ اس سے ذاکر صاحب کی عظمت میں رتی بھر کمی نہیں آتی۔ اس لیے کہ اتفاق سے ان میں سے کوئی انکی عظمت میں رتی بھر بھی اضافہ کا باعث نہیں بن سکی ہے۔

ایسی دو چار مثالیں جو میرے علم میں ہیں، میں عرض کیے دوں، ایسی ہی دو دو، چار چار مثالیں صاحبانِ علم سے جمع کی جا سکتی ہیں۔

جشنِ غالب کے موقع پر فروری ۶۹ء میں وگیان بھون، اور ہمدرد کی غالب اکیڈمی میں انگریزی اور اردو میں لکھی ہوئی تقریریں،

جشنِ عرشی کے موقع پر پڑھی گئی تقریر، جو نذرِ عرشی میں دیباچہ کے طور پر شامل ہے،

اور ساغر نظامی کی انارکلی کا طویل مقدمہ!!

عابد رضا بیدار

تعلیم

۱- صنعتی تعلیم، جامعہ۔ (۱) جنوری ۲۳ : ۴۷-۵۱

۲- (۱) تعلیم و آزادی فکر (۱۱) راہ عمل (رسل کی "سماجی تعلیم کے اصول" سے ترجمہ) جامعہ، اپریل، جولائی ۲۳ء

۳- چین میں اعلیٰ تعلیم۔ جامعہ، جون ۲۶ء۔ ۲ ۳ ۴ (پیکنگ یونیورسٹی کے چانسلر کے مضمون کا ترجمہ)

۴- بیسک نیشنل ایجوکیشن۔ ذاکر حسین کمیٹی رپورٹ، دسمبر ۳۷ء۔ ہندوستانی تعلیمی سنگھ، واردھا : ۲۰۲ ص۔ انگریزی زبان میں گاندھی جی کے پیش لفظ کے ساتھ۔ کمیٹی کے مندرجہ ذیل ممبر تھے :

خواجہ غلام السیدین، کستوری لال مسروالا، کے۔ ٹی۔ شاہ۔ جے۔ سی کمارپا، ونوبا بھاوے، بشری کرشن داس جاجو، کاکا لیکر، آشا دیوی، آر۔ لونا یوکم۔

۵- واردھا تعلیم اسکیم، جامعہ، ۲۹ (۳) مارچ ۳۸ء: ۲۳۵-۲۴۲
— تنقیدوں کا جواب

۶ دوسری بنیادی تعلیمی کانفرنس۔ جامعہ نگر نئی دہلی۔ خطبہ ۱۱ اپریل ۴۱ء: ۱-۱۵

$\frac{۷}{۱}$ بچوں کی جسمانی نشوونما : پیام تعلیم، ۲ر جون ۲۹ء

$\frac{۷}{۲}$ حکومت اڑیسہ کا فیصلہ (پندرہ بنیادی اسکولوں کو بند کر دیتے ہیں۔ ہمدرد جامعہ، اپریل ۴۱ء

۷۔ جنگ کے بعد تعلیم۔ جامعہ۔ ۴۲ (۳) ستمبر ۴۷ء: ۲ - ۹
۲
—— آل انڈیا ریڈیو سے ۲۴ رجون ۴۳ء کو نشر ہوئی۔

۸۔ مولانا آزاد کو اعزازی ڈگری: نئی روشنی دہلی۔ ۲ (۹) یکم مارچ ۴۹ء: ۳، ۵ - یہ تقریر ۲ ر فروری ۴۹ء کو علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے مولانا آزاد کو ڈاکٹری آف تھیولوجی کی اعزازی سند پیش کرتے ہوئے کی گئی:

"اُردو زبان کو اس بات پر فخر ہے کہ وہ آپ کے قلم سے لکھی اور آپ کی زبان سے بولی گئی۔ آپ نے ایک نئے طرز نگارش کی بنیاد رکھی، ایک پُر تاثیر اور ولولہ خیز طرز بیان کی جس میں عربی کا کس فارسی کا رنگ اور ہندوستانی کا لوچ یک جا جمع ہو گئے ہیں۔ آپ نے اس مؤثر آلہ سے فکر کے نکھار اور عمل کے سدھار کا کام لیا ہے۔ اس سے سوتوں کو جگایا ہے غفلت کے ماتوں کو ہوشیار کیا ہے بے عملوں کو راہ عمل دکھائی ہے۔ الہلال اور البلاغ کے ذریعہ ملک اور خصوصاً مسلمانوں کے اندر عام ذہنی بیداری اور رجعت پسندی سے بیزاری پیدا کرنے میں ایک عہد آفریں خدمت انجام دی ہے۔ انھیں للکارا بھی ہے اور ان میں حوصلہ بھی پیدا کیا ہے"

۹۔ بھارت میں تعلیم کا مستقبل۔ آجکل دہلی۔ ۱۲ (۵) دسمبر ۵۳ء: ۷ - ۸
—— نشری تقریر۔

۱۰۔ علی گڑھ۔ علی گڑھ میگزین۔ علی گڑھ نمبر (مرتبہ نسیم قریشی) ۵۳ - ۱۹۵۵: ۴ ص

۱۱۔ علیگڑھ ۱۹۰۳ء کے بعد۔ (علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ کا سلسلہ) علیگ، علیگڑھ۔ ۱ (۹) جنوری ۵۷ء: ۸

۱۲۔ ہندوستان میں تعلیم کی از سر نو تنظیم (مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین، نیشنل بک ٹرسٹ۔ مئی ۶۲ء ۸۸ ص
—— "ایجوکیشن ریکنسٹرکشن اِن انڈیا" کے عنوان سے ۵۸ء میں نشر شدہ سردار پٹیل لیکچروں کا ترجمہ

۱۳۔ تعلیمی خطبات مکتبہ جامعہ دہلی۔ جولائی ۶۱ء (بار دوم) ۲۸۸ ص

— پہلا ایڈیشن مارچ ۱۹۴۳ء میں نکلا جو عبداللطیف اعظمی نے مرتب کیا تھا

مندرجہ ذیل خطبات:

قومی تعلیم :۔	کاشی ودّیا پیٹھ، ۱۴ ، اگست ۳۵ء
مسلمانوں کی تعلیم :۔	مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۲۹ ، مارچ ۳۷ء
طبی تعلیم :۔	طبیہ کالج پٹنہ ۱۹۳۸ء
بنیادی تعلیم :	بنیادی تعلیمی کانفرنس ۱۱ اپریل ۴۰ء
بچوں کی تربیت (۱) :	جامعہ نگر ۱۰ ، مارچ ۳۶ء
بچوں کی تربیت (۲) :	آل انڈیا ریڈیو ۸ ، اپریل ۳۶ء
بچوں کی تربیت (۳) :	" ۲۶ ، اپریل ۳۶ء
ننھا مدرسے چلا :	" ۳۱ ، مئی ۴۲ء
اچھا استاد :	" ۱۵ ، مئی ۳۶ء

ابتدائی اور اس سے پہلے کی تعلیم : نیو ایجوکیشن فیلوشپ، لاہور ۲۴ فروری ۴۶ء

سیرت کی تربیت :	صادق کالج بہاولپور ، ۲۱ اپریل ۴۶ء
جامعہ کے پچیس سال :	جامعہ جوبلی ۴۶ء

قومی تعلیم کے مسائل ایک مسلمان کے نقطہ نظر سے : مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۲۱ ، مارچ ۵۲ء

علیگڑھ سے خطاب : مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ۲۰ جنوری ۵۷ء

(اسی کانووکیشن میں موصوف کو ڈی لٹ کی ڈگری بھی دی گئی تھی)

——— ۱۹۴۳ء والا ایڈیشن "بچوں کی تربیت" کے عنوان سے لاہور : نیا کتاب گھر نے ۶۵ء میں چھاپ دیا ہے!

۱۴۔ ایجوکیشنل ریکنسٹرکشن اِن انڈیا۔ انگریزی (سردار ولبھ بھائی پٹیل لیکچرس، ۱۲-۱۴ ، دسمبر ۵۸ء) پبلیکیشن ڈویژن ستمبر ۵۹ء

۱۵۔ ڈائینیمک یونیورسٹی : ایشیا پبلشنگ ہاؤس بمبئی ۱۹۶۵ : ۱۱۹ ص

— ۱۹۵۷ تا ۱۹۶۲ء کے عرصے میں دیئے گئے کانوکیشن خطبے (انگریزی) (بہاولپور، لکھنؤ، کلکتہ، آنکل (کٹک)، پنجاب (چنڈی گڑھ)، وشوبھارتی، کیرالا (ٹریوینڈرم)، ورل انسٹی ٹیوٹ (کوئمبٹور، گاندھی گرام۔ آئی۔ آئی۔ ٹی (کھڑگپور)، کشمیر، پوسا انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی))

۱۶ - تعلیم اور روایتی قدریں (مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین) جامعہ ۴۷ (۵)
نومبر ۶۲ء : ۲۲۷ - ۲۳۵

۱۷ - کانووکیشن ایڈریس، دہلی یونیورسٹی، ۲۸ نومبر ۶۲ء
سماجی کارکن کام کو فرض سمجھ کر کریں؛ دکھاوے یا اشتہار کیلئے نہیں۔ تعلیم ترقی یونیورسٹی ۵۳ء

۱۸ - آل انڈیا کالجیز کے جوائنٹ کنووکیشن کے موقعہ پر مراد آباد میں تقریر، مارچ ۶۳ء

۱۹ - کنووکیشن ایڈریس، احمد آباد، ۳ اکتوبر ۶۳ء

۲۰ - " نیشنل اسکول آف ڈرامہ اینڈ ایشین تھیٹر۔ ۱۹ اگست ۶۴ء

۲۱ - خطبۂ افتتاحیہ، تامل ناڈ بیسک ایجوکیشن کانفرنس مدراس ۲۲ اگست ۶۴ء

۲۲ - " " یونیورسٹی آف اگریکلچرل سائنسز بنگلور، ۲۱ اگست ۶۴ء

۲۳ - کنووکیشن ایڈریس۔ یو۔ پی اگریکلچر یونیورسٹی پنت نگر، ۳۱ مارچ ۱۹۶۵ء

۲۴ - کیرالا کے سیکنڈری پرائیویٹ اسکول، ہیڈس اسپیشل کنونشن کے موقعہ پر
تقریر، ۲۸ دسمبر ۶۵ء

۲۵ - کنووکیشن ایڈریس، پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ ۴ فروری ۶۷ء

۲۶ - میسور یونیورسٹی میسور ۱۵ دسمبر ۶۶ء

۲۷ - رڑکی یونیورسٹی رڑکی، ۲۷ دسمبر ۶۶ء

جامعہ ملیہ اسلامیہ

۱ - قومی تعلیم اور جامعہ ملیہ اسلامیہ: سہ ماہی تعلیم و تربیت، اکتوبر ۲۸ء

۲ - جامعہ ملیہ کیا ہے؟ :- جامعہ ۳۰ (۶) دسمبر ۳۸ء: ۷۹ - ۴۸۴

۳ - جامعہ کے بچوں میں افتتاحی تقریر :- ہمدرد جامعہ جنوری ۴۴ء: ۱۱-۱۲

... اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں جو دشواریاں پیش آتی ہوں، جو ابتدائی ناکامیاں ہوئی ہوں، وہ بھی آج کی تیاری کی خوشی میں مبارک ہوں۔ ہر ناکامی آپ کے لیے آئندہ کامیابی کا پیش خیمہ اور ہر شکست آنے والی فتح کی بشارت دینے والی ہو۔ ان چھوٹے کاموں میں ناکامی اور کامیابی ہم سب کو بڑے کاموں میں ناکامی پر گھبرانے اور کامیابی پر پھول جانے سے بچاتے اور ہمیں اس سے

"بڑے کام سنبھالنے کا اہل بنادے، آمین"۔

۴۔ جامعہ میں بچوں کے میلہ کی پرچم کشائی کی تقریب پر تقریر

ہمدرد جامعہ، دسمبر ۴۴ء / ۷ جنوری ۴۵ء : ۵-۶

"بھائیو اور عزیزو! آپ سب کو عید مبارک ہو۔ آپ کو عید کا یہ میلہ بھی مبارک ہو۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال جب میں نے بچوں کے میلے کا افتتاح کیا تھا تو میرے پاس مولانا عبیداللہ (سندھی) مرحوم کھڑے تھے۔ اپنی تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ۔ وہ اس وقت بہت بیمار تھے۔ لیکن آپ کی سڑکوں، آپ کی دکانوں، آپ کے کھیلوں کو دیکھ دیکھ کر کیسے خوش تھے۔ ایسے خوش جیسے بس یا تو ایک معصوم بچہ خوش ہوسکتا ہے یا وہ جس کی نظر حاضر کے پردوں میں سے مستقبل کی جھلک دیکھ سکتی ہے۔ افسوس کہ آج وہ بھی ہم میں نہیں ہیں، اور اب کبھی اپنی اس جسمانی شکل میں ہمارے ساتھ نہیں ہوسکتے، لیکن ان کی دعائیں ہمارے ساتھ ہیں اور ان کی تمنائیں ہمارے ہاتھوں پوری ہونے کے لیے بیتاب ہیں۔ شاید اس ملک کی کسی دوسری درسگاہ کو اس دور کے اتنے بڑے بڑے مسلمانوں سے وابستگی کا شرف نہیں ہوگا جتنا کہ جامعہ کو ہے۔ یہ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ، مولانا محمد علیؒ، حکیم اجمل خاںؒ، ڈاکٹر انصاریؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز ہے۔ انھیں پورا کرنے کا فرض ہمارے آپ کے ذمے ہے۔ ذمہ داری بڑی ہے، اور ہم کمزور ہیں۔ لیکن اسے اپنے سر لیا ہے تو پورا بھی کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنی کوشش سے جامعہ کو مسلمانوں کا ایسا مرکز بنانا ہے، جہاں سب اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل پہ یقین رکھتے ہوں، اور اس یقین کے لیے ہر ممکن جدوجہد میں کوتاہی نہ کریں۔ یہ پرچم جس کے لہرانے کا شرف آج مجھے ملا ہے، اسی جامعہ کا پرچم ہے۔ یہ کپڑے کا ایک بے قیمت ٹکڑا ہے! لیکن ان آرزوؤں اور تمناؤں کا علم ہے، جن کا ذکر ابھی کیا، یہ کپڑے کا ٹکڑا ان خیالات، ان افکار، ان مقاصد اور ان حوصلوں کی وجہ سے بے بہا ہے جن کا یہ ترجمان ہے اس حقیقت کہ زندگی

ہلکے پھلکے، میٹھے میٹھے لفظوں سے نہیں بنتی، بلکہ خلوص عمل سے بنتی ہے۔ زندگی نفع و نقصان کا بہی کھاتہ نہیں، بلکہ چند عزائم کے لیے جان کھپانے کا ایک موقع ہے وہ دُھرا جس پر زندگی گھومتی ہے، رنج و راحت کا دُھرا نہیں، بلکہ ترقی منزل، ارتقا و انحطاط کا دُھرا ہے۔ یہ پرچم، باتوں کے مقابلہ میں کام کا، تساہلی کی جگہ سعی پیہم کا، آرام طلبی کی جگہ جفاکشی کا پرچم ہے۔ بیماری کے مقابلے میں تندرستی کا، کمزوری کے مقابلہ میں مضبوطی کا، گندگی کے مقابلہ میں صفائی کا، بدنمائی کی جگہ حُسن کا پرچم ہے۔ جسم کی تندرستی کا بھی اور روح اور ذہن کی تندرستی کا بھی۔ جسم کی مضبوطی کا بھی اور عزم و شباب کا بھی، جسم کی صفائی کا بھی، اور دل کی صفائی کا بھی۔ جسم کے حُسن و تناسب کا بھی، اور روح کی ہم آہنگی بھی۔ یہ ان چیزوں پر یقین کا پرچم ہے اور ان کی پیہم کوشش کا پرچم۔ اور اگر ہم تم اپنے ارادے سے، اپنے کام سے، اپنی ثابت قدمی سے، اسے ان سب کا عَلَم بنا سکیں تو کپڑے کا حقیر سا ٹکڑا دنیا کی سب دولتوں سے زیادہ قیمتی ہو جائے گا، اور اس ملک میں ہمارے لیے باعزت زندگی کا پرچم بن جائے گا۔"

۵۔ شیخ الجامعہ کا خطاب:۔ ہمدرد جامعہ: ۷ (۳) اکتوبر ۴۱ء: ۶

جامعہ کے ساتھیو! چھوٹے ساتھیو اور بڑے ساتھیو!

میں نے بڑوں اور چھوٹوں، دونوں کو ساتھی کہا ہے۔ ساتھی اس لیے کہ ہم سب ایک دوسرے کے ساتھ مل جُل کر کام کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں، جو کام ہمیں کرنا ہے اس میں چھوٹے بھی اتنے ہی شریک ہیں، جتنے بڑے۔ ہم سبھی کو مل جُل کر کام کرنا ہے۔ کچھ سیکھنا ہے، کچھ سکھانا ہے۔ کام میں ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنی ہے۔ ادب، عزت اور محبت کا ہم سب ساتھیوں میں رشتہ ہے اور یہی ہمارے طریق کار کی روح ہے۔

اس سال ہمارے کرنے کے یہ چار کام ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کو یہ چار چیزیں زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

۱۔ صحت۔ ۲۔ طاقت۔ ۳۔ حُسن اور ۴۔ پاکی۔

ان لفظوں کے لیے پرانے لفظ بھی موجود ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر انھیں ترک کر دیا ہے، اس لیے کہ وہ بار بار اس قدر بے موقع اور غلط استعمال ہو چکے ہیں کہ اب وہ اپنے معنی چھوڑ چکے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ان بے جان لفظوں کو استعمال کروں اور میرے کہنے کا مطلب فوت ہو جائے۔ میں کسی موقع سے ہر جماعت کے سامنے علیحدہ علیحدہ اس کی فہم اور سمجھ کے مطابق اس کی وضاحت کروں گا۔
اور مجملاً یہ سمجھ لیجیے کہ ہمیں صحت سے طاقت حاصل کرنا ہے۔ جسم کی صحت، جسم کی طاقت، روح کی صحت، اور روح کی طاقت پھر اس میں حسن پیدا کرتا ہے۔
جسم کا حسن، سیرت کا حسن، پھر ان تمام چیزوں میں پاکی بھی موجود ہے۔ وہ پاکی جو جسم کو پاک رکھتی ہے اور جو روح کو پاک رکھتی ہے۔
مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا ہے۔ اگر ہم نے اس سال ان چیزوں کو حاصل کر لیا تو سمجھو ہم نے بہت کچھ کر لیا۔

۶۔ جامعہ ملیہ نے کیا کیا اور کیا کرنا باقی ہے۔ (مسلمانانِ ہند سے اپیل) ہمدرد جامعہ: ۱۱(۱) اپریل ۷۵ء
۴۲ سال سے زیادہ ہوتے ہیں کہ علی گڑھ میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم کے ہاتھوں سے جامعہ ملیہ کے کام کا آغاز ہوا۔ یہ آغاز اس حقیقت کا ترجمان تھا کہ مسلمانانِ ہند اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر میں آزادی اور یکسوئی کے ساعی ہونا چاہتے ہیں اور اس کام میں ملی تعلیم کی مرکزی حیثیت کو سمجھ گئے ہیں۔ اس کام کے کرنے والوں کے پیش نظر یہ اصول رہا ہے کہ تعمیر ملت کا کام تجارت نہیں خدمت ہے، عبادت ہے۔ ملی زندگی کے انتشار، مرکزی عقائد کی کمزوری، انفرادی اغراض کے تسلط نے مسلمانوں میں ملی خدمت کے اس تصور کو ختم سا کر دیا تھا اور بے غرض خدمت کی مثالوں کے لیے ہم اپنے ماضی کی تاریخ کی ورق گردانی پر مجبور تھے لیکن ملی بیداری کے اس نئے دور میں چند مخلص مسلمانوں نے جامعہ ملیہ کے اندر ایک نئی زندگی کی طرح ڈالنے کا عزم کیا۔"

۷۔۔ ارشادات: تعلیم و ترقی، دسمبر ۶۵ء: ۶
۸۔۔ جامعہ بیت الحکمت: ہمدرد جامعہ ۱۱(۲) مئی ۷۵ء، ص ۱۰-۱۱
۔۔۔ علوم اسلامی کی تحقیقات کے لیے جامعہ میں بیت الحکمت کے نام سے ادارہ

قائم کرنے کی اپیل۔

"قومی زندگی کا مرکز اس کے بنیادی افکار ہوتے ہیں۔ اس کے عقیدے، اس کا نظام اقدار، اس کا معیار کردار، اس کی انفرادی زندگی کے نمونے اور اس کی اجتماعی زندگی کے ولولے ان کے لیے قوم کی انفرادی اور اجتماعی جدوجہد وقف ہوتی ہے تو قومی زندگی کی نشوونما ہوتا رہتا ہے۔ جب اس مرکز پر زندہ اور زندگی بخش افکار باقی نہیں رہتے محض عادتیں اور لفظ رہ جاتے ہیں تو حیات قومی پر جمود طاری ہو جاتا ہے، اس حال میں اداروں کے قیام اور اصلاح کی خارجی تدبیر سے کام نہیں چلتا، ضرورت ہوتی ہے کہ قوم کا کوئی گروہ جرأت اور دیانت سے ان بنیادی افکار کو پھر سے سوچے، ان کی تجدید اور تعمیر نو کی کٹھن منزل خلوص نیت کے سہارے گزارے تاکہ حیات تازہ کے چشمے پھر سے پھوٹیں اور ان افکار و عقائد کے لیے زندہ رہنے اور جان دینے کا ولولہ حیات پرور قوم میں پیدا ہو اور زندگی پھر سے اپنی تشکیل نو میں مشغول ہو سکے۔ مسلمانوں کی موجودہ زندگی اسی نشاۃ ثانیہ کی محتاج ہے"

"بیت الحکمت کا خاص مقصد ہوگا انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متعلق صحیح فکر اسلامی کی نشر و اشاعت، سیاست، معیشت، معاشرت اور تمدن کے جدید نظریات اور اداروں کو اسلامی تعلیم کی روشنی میں پرکھنا اور صحیح اسلامی سیاست، معاشرت اور تمدن کے اصول پیش کرنا۔ اسلامی ہیئت اجتماعی کی صالح نشوونما کے لیے مناسب نظام تعلیم کی ضرورت کو واضح کرنا۔ ان اغراض کے لئے حکمائے اسلام کی تصانیف کا اس طرح شائع کرنا کہ دور حاضر کے لوگ اپنے مسائل کے حل میں ان سے مدد لے سکیں"

"ذاکر حسین ۷، مارچ ۱۹۴۵ء"

۹۔ قرار یا قرار :- نئی روشنی، ۱ (۲) ۲۴ جون، ۱۹۸۸ء - ۲

یہ ڈاکٹر صاحب کی اس تاریخی تقریر کی بالواسطہ رپورٹ ہے جو موصوف نے ۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو گاندھی جی کے جنم دن کے جلسے میں جامعہ طلبہ کی چھوٹی سی جماعت کے سامنے کی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب شمال کی طرف سے مشین گنوں کی آواز آرہی تھی۔ جنوب کی طرف سے مسلح بلوائیوں کے حملے کا خطرہ تھا۔

مشرق کی طرف سے ستائے ہوئے سہمے ہوئے دیہاتی آکر جامعہ میں پناہ لے رہے تھے۔ اور مغرب کی طرف سے ہمایوں کے مقبرے کا اور وہاں سے پاکستان کا راستہ کھلا ہوا تھا۔)

"قوموں کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے نازک موقع آتے ہیں، یہ وقت قدرت کی طرف سے آزمائش کا ہوتا ہے۔ اب آپ کے سامنے یہ سوال ہے کہ آپ اس آزمائش سے گزرنا چاہتے ہیں یا اس سے بچ کر بھاگ نکلنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کا فیصلہ بھاگنے کا ہے تو بسم اللہ . . . . پاکستان کا راستہ کھلا ہوا ہے جو جانا چاہے شوق سے جائے، مگر یاد رکھئے موت آپ کا پیچھا وہاں بھی نہ چھوڑے گی۔ کتنے ہوں گے جو راہ میں مارے جائیں گے کتنے ریل کے بند ڈبوں میں گھُٹ گھُٹ کر مر جائیں گے۔ لیکن اگر آپ کا فیصلہ اس آزمائش سے گزرنے کا ہے تو پھر یہاں ڈٹ جائیے۔ یہ یاد رکھئے کہ بہت ممکن ہے آپ مار ڈالے جائیں، لیکن آپ کا یہ قتل رائیگاں نہیں جائے گا۔ بعض قتل ایسے ہوتے ہیں جن پر قاتل شرماتا اور مقتول فخر کرتے ہیں۔ بعض قتل ایسے ہوتے ہیں جو پوری زندگیوں پر بھاری ہوتے ہیں۔
بعض قتل گرتی ہوئی قوموں کو سنبھال لیتے ہیں۔ گری ہوئی قوموں کو اٹھا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ جامعہ کے لوگ اگر ایسے مقتولوں میں داخل ہو جائیں تو وہ کام کر جائیں گے جو پچھلے سب کاموں پر بھاری ہوگا۔
جو لوگ موت کے استقبال کے لیے تیار رہتے ہیں ان کے لیے زندہ رہنے کی راہیں بھی نکل آتی ہیں۔ کیا عجب ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کی کشتی جس کو غلط رہنمائی نے اس بھنور میں ڈال دیا ہے، آپ کے کمزور ہاتھوں سے پار لگ جائے۔ کیا عجب ہے کہ خدا آپ ہی کے ہاتھ سے مسلمانوں کی تنظیم کا کام لے، جس کی بنا خدا کے خوف اور خلق خدا کی محبت، وطن کی وفاداری اور اہل وطن کی خدمت پر استوار ہو۔

۹۔ آپ کی سند۔ ایڈیٹر رسالہ جوہر، جامعہ ملیہ کے لیے پیغام
ہمدرد جامعہ فروری ۱۹۴۸ء : ۴۰-۳۴ (مکتوب ۴ نومبر ۱۹۴۷ء)

"کالج میں چند سال رہنے کا ظاہری مقصد ایک سند حاصل کر لینا ہے۔ وہ سند اس

بات کی تصدیق ہوگی کہ آپ علم کی کسی نہ کسی شاخ میں دستگاہ رکھتے ہیں۔ اس کے مسائل کو سمجھتے ہیں۔ اس کے حدود سے واقف ہیں۔ اس کو کم سے کم اپنے ممتحن کے سامنے کم و بیش وضاحت کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ سند یہ نہ بتا سکے گی کہ آپ کو اس علم سے واقعی کوئی لگاؤ بھی ہے یا نہیں، اور اس سے ذہن کی جو تربیت ممکن ہے وہ بھی آپ کے حصہ میں آئی ہے یا نہیں۔؟ کوشش کیجیے کہ کم سے کم آپ خود اس سند کے بین السطور میں یہ بھی درج پا سکیں کہ "انھوں نے اس علم کے خزانے کی ایک کنجی بھی بنائی ہے جس سے اسے کھول سکتے ہیں اور فیضیاب ہو سکتے ہیں۔ انھیں اس مملکت کا نقشہ پڑھنا بھی آتا ہے، یہ اس میں مختلف مسائل کی جگہ متعین کر سکتے ہیں۔ یہ ذہنی کاہلی کی وجہ سے سوال کی تہ تک جانے سے نہیں کتراتے اور بہتر دماغوں کی مدد سے اپنے خیال اور علم میں وضاحت کرنے کی سعی سے کتراتے نہیں۔"

۹/۲ بمبئی سے واپسی پر جامعہ میں تقریر :- ہمدرد جامعہ ۱۱ (۲) مئی ۱۹۴۵ء: ۱۱-۱۰

——— "آپ لوگوں کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ تقریباً یہ ساری رقم (۷۷ ہزار روپے) مسلمانوں نے دی ہے۔ (اس میں صرف ۵ ہزار کی رقم ایسی ہے جو دو ہندوؤں نے دی ہے۔ اگرچہ بعض پارسیوں اور دوسری قوموں کے افراد نے جامعہ کی امداد کی طرف میلان ظاہر کیا لیکن ان سے نہیں کیا گیا، اس لیے کہ جامعہ ملیہ ایک اسلامی ادارہ ہے اور اس کی امداد بھی مسلمانوں ہی کی جانب سے ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کے لیے یہ امر باعث ننگ و ملامت ہوگا کہ ایک اسلامی ادارہ دوسری قوم کے افراد کے سرمائے سے چلایا جائے۔ اگرچہ بمبئی میں واردھا اسکیم کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں، لیکن ان پر مسلمانوں کی تعلیم واضح ہونے کے بعد رفع ہو گئیں۔"

۹/۳ - جامعہ کے لیے چندہ - تقریر :- ہمدرد جامعہ ۱۱ (۴) جولائی ۱۹۴۵ء: ۱۲-۱۱

۱۰ - بمبئی کے دورے میں تقاریر اور گفتگوئیں : ہمدرد جامعہ : جون ۱۹۴۵ : ۷-۱۲؛ ستمبر ۱۹۴۵ء: ۷ - ۱۴

——— بنیادی تعلیم کے اصول؛ مذہبی تعلیم کا مسئلہ؛ مسلمانوں کی قومی تعلیم؛

پُرانا تعلیمی نظام؛ ابتدائی تعلیم؛ یہ غفلت؛ ثانوی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم؛ اور دینی مدارس کا حال

١١ جامعہ کتب خانہ :- (ہمدرد جامعہ ١١ (٤) جولائی ٤٥ء : ١١-١٢

— اس میں ذکر ہے کہ جوبلی کے موقعہ پر علیحدہ سے بھی پمفلٹ کی شکل میں شائع ہوا۔
— "اسلامی اور ہندستانی تاریخ و تمدن کے متعلق کتابوں کا اچھے سے (اچھا ذخیرہ فراہم کیا گیا"

١٢- ٹاٹا ٹرسٹ کا شاہانہ عطیہ :- ہمدرد جامعہ : ١١ (٤) جولائی ٤٥ء: ٥-٦

— "لوگ کہا کرتے ہیں کہ ٹاٹا والے جس چیز کو بھی چھو دیتے ہیں وہ سونا بن جاتی ہے۔ مگر میں ٹاٹا کی جس چیز کی قدر کرتا ہوں، وہ ان کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ دولت پورے سماج کے فائدے کے لئے اور انسانی ہمدردی کے کاموں پر صرف کرتے ہیں"

١٣- متبرک مہینے :- وظائف کیلئے اپیل۔ ہمدرد جامعہ- ١١ (٤) جولائی ٤٥ء: ٣-٤

— جامعہ ملیہ کے نادار طلبہ کے وظائف کے لئے مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ زکوٰۃ کی رقم میں سے کچھ حصہ جامعہ ملیہ کو دیں۔ ساتھ میں قرآن کے حوالے اور شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات کے حوالہ سے زکوٰۃ کی اہمیت کو سمجھایا ہے۔

١٤- مسجد جامعہ نگر :- ہمدرد جامعہ- ١١ (٤) جولائی ٤٥ء: ١٠-١١- جوبلی کے موقعہ پر علیحدہ سے پمفلٹ بھی۔

١٥ جامعہ کیا ہے؟ پمفلٹ ١٩٤٦ء

١٥ الف :- جامعہ کے بچوں کے نام شیخ الجامعہ کا پیام :- پیام تعلیم- دہلی جوبلی نمبر دسمبر ٤٦ء : ٤٤-٤٧

١٦- جامعہ والوں سے :- جامعہ- ٤٤ (٥) نومبر، دسمبر ٤٦ء ٣-٤

١٦ الف :- جامعہ کا نشان :- پیام تعلیم، دہلی، جوبلی نمبر ٢٨ (٢، ٣) نومبر، دسمبر ١٩٤٦ء ٥٥-٥٧

١٧- پچیس برس گزر گئے :- جامعہ- ٤٤ (٥) نومبر، دسمبر ٤٦ء : ٥-٧
آج کل دہلی ٥٠ (١٥) جنوری ٤٨ء : ١٢-١٨؛ ہمدرد جامعہ اکتوبر، نومبر ٤٦ء

١٨- جامعہ کے نام بچوں کے نام - پیام تعلیم- ٢١ جولائی ٤٧ء، جون ٤٩ء

١٩- آزاد تعلیم کا ایک تجربہ :- نئی روشنی، دہلی ١ (١٩) یکم نومبر ٤٨ء: ٢
— جامعہ جوبلی پر خطبہ

٢٠- تحریک جامعہ سکاؤٹ کے افتتاح کے موقع پر تقریر ہمدرد جامعہ جنوری ۵۳ء

٢١- نئے سال پر پیام- ہمدرد جامعہ، فروری ٤١ : ٤

کہانیاں

۱۱ - ابّو خاں کی بکری، اور چودہ اور کہانیاں، دہلی مکتبہ جامعہ سنی ۶۳ء:
۱۳۶ ص - پہلی بار الگ الگ کتابچوں میں چھپی تھیں -
مندرجہ ذیل کہانیاں :
(۳۸ء)
(۱) ابّو خاں کی بکری (۲) عقاب (۳) سعیدہ کی اماں (۴) جولاہا اور بنیا -
(۵) چھپنّو (۶) اندھا گھوڑا (۷) آخری قدم (۸) سچّی محبت (۹) ماں (۱۰) بیکاری
(۱۱) پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی (۱۲) مرغی اچھی علی (۱۳) مرغی کا نڑالا بچّہ
(۱۴) اسی سے ٹھنڈا اسی سے گرم (۱۵) آؤ گھر گھر کھیلیں -

۲ - کچھوا اور خرگوش : ذاکر صاحب کی وفات کے بعد ۱۹۷۰ء میں نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نے شائع کی
اپنے آپ کو پہچانو، اس تعلیم پر ایک خوبصورت تمثیلی کہانی

مذہب، زبان، ادب اور کلچر

۱ - بانیِ مذہب : الناظر لکھنؤ - ۱۲ (۷۰) اپریل ۱۵ء : ۲۱ - ۳۶ (ہراز ن ٹر)
۲ - تاریخ اسلام کے چند پہلو : جامعہ میں بہت دھی کی تقریروں کا خلاصہ
جامعہ، اپریل ۳۴ء : ۱۷۵ - ۱۶۴

۳/۱ - دیوان غالب اردو (مرتبہ و مذھّبہ) برلن، کاویانی پریس ۱۹۲۶ء
۳/۲ - دیوان حکیم اجمل خاں شیدا :- (״ ״ ״ ״ ״)

۳ - ہزار سالہ جرمن ادب (ترجمہ) جامعہ ۶ (۵) مئی ۲۶ء : ۳۱۵ - ۳۲۳
—— جرمنی کے ڈاکٹر موریس گولڈ اسٹائن نے یہ مضمون خاص رسالہ کیلئے لکھا ہے -

۴ - موزہ (ترجمہ) ۳۶ (۳) : ۲۸۰ - ۲۸۳ —— ایک روسی ادیب کے
مختصر افسانہ کا ترجمہ جس میں جدید روسی دفتریت کا ایک طنزیہ خاکہ ہے -
—— لندن کے "نیو اسٹیٹسمین اینڈ دی نیشن" سے ماخوذ -

۵ - ہندستانی کیا ہے :- اس نام کے ایک کتابچہ میں شامل مضمون جس
میں دوسرے لکھنے والے سجاد ظہیر اور ...... ہیں
—— ڈاکٹر زیڈ احمد کی کتاب "ہندستان کا لسانی مسئلہ" میں انگریزی میں"

آل انڈیا ریڈیو سے براڈکاسٹ ص ۹۷ - ۱۰۰ - زبیدہ احمد کی کتاب
کے دیباچہ کی تاریخ، نومبر ۱۹۴۴ء

۶- مضمون در طلوع اسلام شمارۂ اولین: مرتبہ نذیر نیازی: ۱۹۳۶ء

۷- ذکر حسین: مئی ۴۲ء: ۳۲ ص
—— ۲۲ مارچ ۴۲ء کی ریڈیائی تقریر جو جامعہ میں "یادگار حسین" کے عنوان سے اپریل میں چھپی ہے اور "علیگ" علیگڑھ میں اگست ۵۵ء میں بھی چھپی ہے —— نظر ثانی کے بعد کتابچہ کی صورت میں۔

۸- حالی محبِ وطن: کتابچہ، دہلی اردو گھر، ۱۹۴۳ء، ۴۵ ص
—— اکتوبر ۳۵ء میں حالی صدی کے موقع پر پڑھا گیا۔

۹- حکیم صاحب (حکیم اجمل خاں): جوہر جوبلی نمبر (مرتبہ محمد عرفان نوری) نومبر ۴۶ء: ۱۷۴ - ۱۷۹

۱۰- ڈاکٹر انصاری: - جوہر جوبلی نمبر —— نومبر ۴۶ء: ۱۸۰ - ۱۸۴
—— ڈاکٹر انصاری صاحب کے انتقال پر ریڈیائی تقریر

۱۱- سیرت کی تعمیر: نئی روشنی دہلی ۱ (۱۵) یکم اکتوبر ۴۸ء: ۲ / ۱۲
—— "سیرت کی تعمیر کے لئے چار عناصر کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ ارادے کی قوت کا ایک کم سے کم درجہ، اجتہاد فکر کا ایک کم سے کم مرتبہ، حسِ جماعتی کی ایک کم سے کم ذکاوت، اثر پذیری کی ایک کم سے کم وسعت، گہرائی اور پائداری۔

۱۲- بھائیو! دوستو! ساتھیو: آل انڈیا ریڈیو سے ستمبر ۴۷ء کی ایک تقریر، دیال پریس دہلی، ۸ ص۔ نئی روشنی دہلی، ۲ (۱۲) ۲۴ اپریل ۴۹ء: ۳ / ۱۲

۱۳- حسینؓ اور انسانیت: نئی روشنی، دہلی ۱ (۲۱) ۱۲ نومبر ۴۸ء ۲ / ۱۲

۱۴- ہند اور کشمیر کا ناتا: آجکل، دہلی ۸ (۸) دسمبر ۴۹ء: ۲-۴
—— کشمیر سے ہمارے رشتے کو کون کیسے کاٹ سکتا ہے؟ جس ساتھ پر صدیوں پر

صدیاں گزر گئی ہوں، جو ساتھ خالی جغرافیائی ساتھ نہ ہو، خالی حکومت کا ساتھ نہ ہو، بلکہ جس میں ہم دونوں کی، ہندوستان اور کشمیر کی تمدنی زندگی کا رواں رواں بندھا ہوا ہو، جو خوشی اور رنج، آرام اور مصیبت، سکھ دکھ کا ساتھ ہو۔ اس کی تفصیل چند منٹ میں کیسے بیان ہو جائے؟

"ایک کشمیری ہی آج ہندوستان کا وزیر اعظم ہے۔ دیس میں سب کی آنکھوں کا تارا۔ ایک نئی ابھرتی جمہوریت میں سچی اور اچھی بات کا سہارا سچ کی کڑواہٹ سے نہ گھبرانے والا، مصیبت اور بپتا میں سب کے کام آنے والا۔ وہ جس کی بے لاگ صفائی، جس کی بے باک سچائی، اچھائیوں کے لئے جس کی بصیری، برائیوں سے جس کی بیزاری، جس کی دیانت، جس کی دلیری، ہمارے دیس کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ اور کشمیر نے خود اپنے لئے پیدا کیا ایک قافلہ سالار، خدمت گزار شیخ محمد عبداللہ۔ جس نے کشمیریوں کو ایک امید بخشی، ان میں خود اعتمادی پیدا کی، ان کے دلوں کو گرمایا، اور اپنے خلوص، اور اپنی قربانی، اور اپنی محنت سے خدمت گزاروں کا ایک گروہ اپنی قوم میں تیار کر دیا۔ جس نے اپنی سعی پیہم سے قوم کو اس کے آئیڈیل کے حصول کے روبرو لا کھڑا کیا۔ ان دونوں جواں ہمت شخصیتوں کا باہمی ربط و اتحاد ہر ہندوستانی اور ہر کشمیری کے دل و دماغ پر پڑ رہا ہے۔ یہ دونوں اپنی جگہ ہماری سیاسی زندگی کے بنیادی مسئلے کو حل کرتے ہیں۔ کسی ایک عمومی جمہوریت کے قیام کے لئے جس میں مذہب کا فرق شہریت پر اثر انداز نہ ہو، یہ دونوں وہ کام کر رہے ہیں جو قوموں کے بڑے بڑے معمار کرتے ہیں۔

ان کی کامیابی ہماری زندگی کی سب سے بڑی کامیابی ہوگی۔ ہر ہندوستانی اور ہر کشمیری اس مقصد کے حصول میں ان کا ساتھی ہے۔"

۱۵۔ گاندھی جی : بچوں کے لئے ریڈیائی تقریر، ۳ر جنوری ۱۹۴۵ء

۱۶۔ شخصیت کی تعمیر : علیگ، علیگڑھ ۱(۹) ۱۰ر جنوری ۱۹۵۷ء

ابوالکلام آزاد ـ ایک ہمہ گیر شخصیت : آجکل، دہلی، آزاد نمبر، ۱۷ (۱)، ۱۱ ـ ۱۲

ــــ یہ تقریر ۲۳ر فروری ۵۸ء کو صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی صدارت

میں وفات کے دوسرے دن دلی کے ایک تعزیتی جلسے میں فرمائی تھی۔
"نیا خواب" رامپور میں ۱۶ فروری ۶۳ء کو بھی چھپی ہے۔

۱۸۔ بہادر شاہ ظفر (مترجم ڈاکٹر عابد حسین) جامعہ ۴۷ (۶) دسمبر ۶۲ء

۱۸/۱ جگر مرحوم کو خراج عقیدت، جامعہ نومبر ۶۳ء

۱۹۔ اردو میری زبان: پٹنہ کے ادارہ تحقیقات اردو کی ایک تقریب میں تقریر ۶۲ء؛ منقولہ "نثر کا حسن" رامپور ۶۸ء ۲ ص

۲۰۔ دل کے خون سے لکھی ہوئی تحریریں: "نیا خواب" رام پور، علیگڑھ منبر (۱، ۶، ۷) ۱۶ دسمبر ۶۲ء؛ ۶-۷

۲۱۔ گاندھی جی کا راستہ: جامعہ، ۵۶ (۵) نومبر ۶۷ء؛
— خطبہ جلسہ تقسیم اسناد، ۱۸ اکتوبر ۶۷ء کو گجرات ودیا پیٹھ

۲۲ یوم غالب: خطبۂ افتتاحیہ، اردوئے معلیٰ دہلی یونیورسٹی، غالب نمبر ۲ (۲، ۳): ۸-۱۰

۲۳۔ غالب: غالب میموریل ہال کا بنیادی پتھر رکھنے کے موقعہ پر ۱۵ فروری ۶۸ء: ہماری زبان علیگڈھ ۲۷ (۹) یکم مارچ ۶۸ء: ۹-۱۰

۲۴۔ مارل ادبرنیس: مہاتما گاندھی، ہنڈریڈ ایرس (سو سال) مرتبہ ڈاکٹر رادھا کرشنن۔ نئی دہلی گاندھی پیس فاونڈیشن ۶۸ء ۸-۱۰ ص

۲۵۔ چسٹرٹن کے ایک مضمون کا ترجمہ (مع ذاکر رشید مقالہ) علیگڑھ میگزین، فروری ۲۱ء

۲۶۔ علی گڑھ میگزین (انگریزی) میں RIP اور خود اپنے نام سے بعض مضامین (منگو مارچ ۲۰ء)

سیاسیات

۱۔ السٹر کا خواب (ولیم شور سے ترجمہ) جامعہ ۱ (۵) مئی ۲۳ء

۲۔ خالدہ خانم سے انٹرویو:- جامعہ ستمبر ۲۲ء

۳۔ گاندھی جی پر:- الفریڈ اہرنٹ ولیٹن کے اشتراک میں، جرمن زبان میں کتاب۔ ۱۹۲۶ء

۴۔ مشرق و مغرب: جامعہ ۸ (۳) مارچ ۲۷ء: ۱۶۱-۱۶۷

۵۔ آسٹریائی فلسفی کوڈین ہوف کلرگ کے افکار پر مبنی" ینگ مینس انسٹی ٹیوٹ پٹنہ میں ایک لیکچر

۶۔ ریاست یا حقیقی عدل: انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۲ء: مقدمہ کتاب

۲۷ر فروری ۱۹۳۲ء ۔ دوسرا ایڈیشن ساہتیہ اکادمی، بہ تعاون یونیسکو ۱۹۶۷ء ۔ مقدمہ کی تاریخ ۲۰ر مئی ۶۶ء ہے پہلی بار، ایک باب: میگزین، جنوری ۲۰ء

۷۔ علم سیاست اور اجتماعی تباہی (ترجمہ) جامعہ، ۱۰ (۲۴) اکتوبر ۲۵ء ۸۵۹ ۔ ۸۶۴ مشہور اطالوی عالم موسکا کی تصنیف "سیاست بحیثیت علم" سے ماخوذ ۔

۸۔ فاشزم (ترجمہ): جامعہ، ۱۰ (۴۴) ۸۶۵ ۔ ۸۷۰
مسولینی کے مقالہ کا ترجمہ جو انسائیکلوپیڈیا اٹالیانا کی ۱۴ ویں جلد کے لئے مسولینی نے ۳۲ء میں لکھا تھا۔

۹۔ آزادی کی سہولتیں اور دشواریاں مبارک: نئی روشنی دہلی، ۳ (۷) ۱۶ر اگست ۴۹ء: ۱، ۴ ۔
— یہ تقریر موصوف نے پہلے یوم آزادی کے موقع پر آل انڈیا ریڈیو سے نشر فرمائی تھی۔

دُنیا کی رفتار :-

۱۔ ترکی اور جنگ عظیم: جامعہ، ۱۳ (۲) ۲۹ء: ۹۹ ۔ ۱۰۸

۲۔ ترکی قوم پرستی اور اتحاد تورانی :۔ جامعہ، ۵
(خالدہ ادیب خانم کی خود نوشت کے ایک باب کا ترجمہ)

۳۔ چین و جاپان ۔ برطانیہ، آئرستان، جرمنی :۔ جامعہ، ۱۸ (۳) مارچ ۳۲ء: ۲۸۲ ۔ ۲۸۶

۴۔ چین و جاپان، برطانیہ، آئرستان، جرمنی : جامعہ، ۱۸ (۴) اپریل ۳۲ ۳۸۴ ۔ ۳۸۸

۵۔ چین اور منچوریا۔ جاپان، فرانس جنوب مشرقی یورپ کا معاشی اتحاد :۔
جامعہ، ۱۸ (۵) مئی ۳۲ء: ۴۷۲ ۔ ۴۷۸

۶۔ انگلستان، ایک اہم تقریر جرمن پارلیمنٹ ۔ جامعہ، ۲۰ (۱) جنوری ۳۳ء: ۸۴ ۔ ۸۸

۷۔ بین الاقوامی قرضے، جرمنی اور انقلاب : جامعہ، ۲۰ (۲) فروری ۳۳ء ۹۰ ۔ ۱۹۳

۸۔ انگلستان ۔ امریکہ اور معیشت عالم، ہٹلر کا پروگرام، جامعہ ۲۰ (۴) اپریل، ۳۳ء: ۳۷۱ – ۳۷۷

۹۔ یورپ اور آنے والی جنگ، جرمن، فرانس، برطانیہ، جرمنی میں یہودی، جامعہ ۲۰ (۵) مئی ۳۳ء: ۸۰ – ۸۸

۱۰۔ جاپان اور ہندستان، انتقال عدن، معاشی کانفرنس، روس اور سرمایہ دار ممالک، جامعہ، ۲۱ (۱) جولائی ۳۳ء: ۸۰ – ۸۸

۱۱۔ جاپان ۔ معاشی کانفرنس، جرمنی آسٹریا ۔ جامعہ، ۲۱ (۳) ستمبر ۳۳ء: ۲۷۱ – ۲۷۷

۱۲۔ روس، تخفیف اسلحہ: جامعہ، ۲۱ (۶) دسمبر ۳۳ء: ۵۶۷ – ۵۷۳

۱۳۔ روس اور جاپان، امریکہ: جامعہ فروری ۳۴ء: ۹۰ – ۹۸

۱۴۔ ہسپانیہ، علاقہ سار، میثاق بلقان ۔ جامعہ ۔ مئی ۳۴: ۱۹۴ – ۲۰۵

۱۵۔ جاپان ۔ فرانس، آسٹریا، جرمنی: جامعہ، اگست ۳۴: ۲۹۱ – ۳۰۲

۱۶۔ یورپ ایک دلچسپ دستاویز: جامعہ، ۲۴ (۱) جولائی ۳۵ء: ۵۴۳ – ۵۵۳

۱۷۔ حبش ۔ عقبہ ۔ ترکی ۔ عراق اور ایران ۔ روس، جامعہ ۲۴ (۲) اگست ۳۵ء: ۶۵۱ – ۶۶۳

۱۸۔ حبش اور اٹلی ۔ اسپین ۔ یوگوسلاویہ، رومانیہ ۔ یونان، چین: جامعہ ۲۴ (۳) ستمبر ۳۵ء: ۷۶۳ – ۷۷۵

۱۹۔ جمعیۃ اقوام اور جنگ حبش ۔ جاپان اور حبش، پہلا اور حبش: جامعہ ۲۴ (۴) اکتوبر ۳۵ء: ۸۷۱ – ۸۷۸

۲۰۔ جنگ حبش: جامعہ ۲۴ (۵) نومبر ۳۵ء: ۹۶۷ – ۹۷۱

۲۱۔ برطانیہ اور اٹلی ۔ یونان میں شاہی جزائر فلپائن کی آزادی: جامعہ ۲۴ (۶) دسمبر ۳۵ء: ۱۰۶۳ – ۱۰۷۲

۲۲۔ چین و جاپان اور مغرب، حبش اور جمعیۃ اقوام ۔ جامعہ، ۲۵ (۱) جنوری ۳۶ء: ۸۸ – ۹۴

۲۳۔ چین، جاپان اور دول مغرب، ایک چینی اخبار سے اقتباس جامعہ ۲۶ (۱) جنوری ۳ء: ۸۸ – ۹۷

۲۴۔ جنگ حبش اور سیاست مغرب، فرانس اور اٹلی جرمنی اور اٹلی۔ بحر الکاہل کے چند گمنام جزیرے۔

۲۵۔ جاپان کا ظلم۔ جامعہ۔ ۲۶ (۲) فروری ۳۶ء: ۱۰۱-۱۰۶

۲۶۔ چین وجاپان کے تعلقات، منگولیا، وسائل معاشی۔ چند اعداد جرمن مالیات، جامعہ، ۲۶ (۴) اپریل ۳۶ء: ۳۲۹-۳۴۳

۲۷۔ روس اور ایشیا میں صنعت جدید کی ترقی۔ ترکی۔ ایران۔ افغانستان سن کیانگ۔ جامعہ ۲۷ (۶)، دسمبر ۳۶ء: ۱۰۱۱-۱۰۱۸

الف ۲۷۔ برطانوی وزارت کی تبدیلی، جاپان، سیاسی ملاقاتیں اور وسطی یورپ کی تنظیم، اسپین۔ جامعہ۔ جولائی ۳۷ء: ۵۷۵-۵۸۴

۲۸۔ کانگریسی وزارتیں: جامعہ، ستمبر ۳۷ء: ۷۸۹-۷۹۳

۲۹۔ چین اور جاپان، منگولیا کی خود مختاری، روس اور چین کا معاہدہ: جامعہ، اکتوبر ۳۷ء: ۸۶۷-۸۷۲

معاشیات۔

۱۔ مبادی معاشیات: یعنی ایڈورڈ کینن پروفیسر معاشیات لندن یونیورسٹی کی کتاب ایلمنٹری اکانومی کا اردو ترجمہ، از ذاکر حسین خاں بی۔ اے۔ اُستاد معاشیات جامعہ ملیہ اسلامیہ، علی گڑھ۔ علی محمد خاں کے اہتمام سے مطبع جامعہ ملیہ علیگڈھ میں طبع ہوئی اور شعبۂ تصنیف جامعہ ملیہ نے شائع کی: ۲۲ء: ۱۴۰ ص

۲۔ نرخ مبادلہ: جامعہ ۱ (۱) جنوری ۲۳ء: ۴۳-۵۱

۳۔ معاشیات: جامعہ ۶ (۴) اپریل ۲۶ء: ۲۵۵-۲۶۷

"معاشیات کا وجود بس اس وجہ سے ہے کہ انسان مختلف ضروریات رکھتا ہے اور مجبور ہے کہ ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مشقت اُٹھائے۔ اگر آدمی کو اپنی حاجتیں رفع کرنے کے لئے کام کرنے کی ضرورت نہ ہوتی اور جن چیزوں سے یہ رفع ہوتی ہیں، وہ اسے یونہی بیٹھے بٹھائے مل جایا کرتیں تو معاشیات کا وجود ممکن نہ تھا۔ اگر آج دنیا میں ہر شخص کو بازیگر کا وہ ٹکا ہاتھ آجائے جس سے وہ

اپنے مٹکے کے اندر سے یا ٹوکرے کے نیچے سے جو چاہیے بتا دیئے نکال لیتا ہو تو دنیا کے تمام جامعوں میں معاشیات کا درس کل ہی بند ہو جائے لیکن جب تک ایسا نہ ہو ہمیں اسی حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ انسان کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جن مادی اشیاء کی ضرورت ہے وہ محدود ہیں، اور اس کی آرزو کی کوئی انتہا نہیں۔ قدرت نے انسان کی فطرت میں سیری نہیں دی۔ اس کا ذہن اور اس کا دل ہر وقت نئے نئے مقاصد اور نئی آرزوؤں کا مولد ہے۔ ؎

دمادم آرزو آفرینی!!
مگر کارے نداری اے دل! اے دل

۴ ۔ ہندستان کی معیشت زرعی، جامعہ، ۷ (۱)، جولائی ۲۶ء:
۶۴۹ - ۶۶۳

۵ ۔ (۱) بنگال میں عطایہ دیوانی سے قبل۔
(۲) عطایہ دیوانی کے بعد۔ جامعہ ۷، (۲) اگست ۲۶ء: ۱۲۲ - ۱۳۴

۶ ۔ بندوبست دوامی ۔ جامعہ ۷ (۵) نومبر ۲۶ء: ۳۷۱ - ۳۸۴

—— اس مقالہ کا تعلق گزشتہ دو مضامین سے ملتا ہے جو رسالہ جامعہ میں "ہندوستان کی معیشت زرعی" کے عنوان سے پچھلے شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس مضمون میں ایک ہندستانی معیشت کی تاریخ کے مورخ کی حیثیت سے عالمانہ بحث کی گئی ہے۔

—— "لیکن شخصی احساس احسانمندی سے ذرا علیحدہ ہو کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بندوبست بس اس لئے کیا گیا کہ کمپنی کے لئے یہی بہترین مالی حل تھا۔ اور اس سے سوائے کمپنی کے فائدے کے جو فوائد ہندستان کے لئے ممکن سمجھے جاتے تھے اور جن پر ممکن ہے خود لارڈ کارنواس کو یقین ہو وہ محض دھوکا ہے، نفس کا وہ دھوکا جو آدمی خود اپنے کو دے لیتا ہے تاکہ اپنے مقصد کے حصول میں اپنی اخلاقی قوت کو بڑھا سکے۔"

"مختصر یہ کہ اس بندوبست دوامی نے کسانوں کے حقوق کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا اور اس کے عوض جو طبقہ امرا قائم کیا وہ ایسا کہ اسے ۵۰ سال کے اندر نیلام جائیداد کے ذریعہ کم و بیش تین مرتبہ اپنی جگہ دوسروں کے لئے چھوڑنی پڑی اور جو اوسطاً ۵۰ روپیہ ماہوار آمدنی والے خاندانوں پر مشتمل ہے یہ غریبوں کو فقیر اور اپنے بنائے ہوئے امیروں کو غریب کر دینے والا انتظام یہ یک کرشمہ دو کار والی انگریزی حکمت عملی کا بہترین نمونہ ہے۔"

اشتراک ۔ ۱۲ (۲، ۴)، فروری، اپریل ۲۹ء : ۱۴-۳۴-۲۷۶-۲۸۵

"انسان کی جماعتی زندگی پر نظر ڈالئے۔ ہر طرف دو متضاد قوتیں کارفرما دکھائی دیں گی۔ ایک قوت جوڑتی ہے دوسری توڑتی ہے۔ ایک باندھتی ہے دوسری کاٹتی ہے۔ ایک ملاتی ہے دوسری جدا کرتی ہے۔ ایک وحدت و تنظیم کی طرف لے جاتی ہے دوسری کثرت و انتشار کی طرف۔ ایک محبت کی قوت ہے دوسری نفرت کی۔ ایک مثبت ہے دوسری منفی، ایک الہٰی ہے دوسری ابلیسی۔"

"ایک وہ ہے جس نے معنی و مفہوم سے خالی فرد کو جماعت میں لا کر با معنی بنایا، فرد کے سینے میں جماعتی زندگی کی لگن لگائی۔ عقائد کے اختلاف کے باوجود ایک خالق اور ایک رب کو سب سے منوا کر۔"

"اس مضمون میں ہم اشتراک کو اس کی اصل کے اعتبار سے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ ہم اس جگہ اس ماحول کا مختصر سا ذکر قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں جس میں اشتراک کے مسلک نے جنم پایا۔ اس کے بعد ان شخصیتوں کا حال بیان کریں گے جن کی کاوش نے اس ذہنی پودے کی آبیاری کی اور ان رائج الوقت تصورات و خیالات کا جنھوں نے اسکی نشوونما میں حصہ لیا اور اس طرح مذہب اشتراک کی موجودہ شکل میں رونما ہونے کے اسباب تین حصوں میں ہمارے سامنے آ جائیں گے۔ یعنی جماعتی حالات رائج الوقت تصورات اور بانیوں کی ذہنی کیفیات۔"

۸ ـ مذہب اشتراک کے بانی : جامعہ، ۱۲ (۳) مارچ ۳۰ء : ۱۷۹-۱۹۱

— (اس مقالہ کو گویا پچھلے مقالہ کی دوسری قسط سمجھ لیجیے۔)

"نتائج تاریخی کے لئے ماحول اور شخصیت کی اعتباری اہمیت کا مسئلہ بہت پیچیدہ اور مختلف فیہ ہے۔ کچھ لوگ تاریخ کو تمام تر حالات گرد و پیش کا میکانکی نتیجہ تصور کرتے ہیں۔ کچھ اسے بڑی شخصیتوں کی کارگزاری سے تعبیر کرتے ہیں فلسفہ تاریخ کے اس دشوار مسئلہ کے متعلق بحث کرنا یہاں مقصود نہیں بصرف اُس لئے اس طرف اشارہ کیا گیا کہ ہماری رائے میں مذہب اشتراک کی فہم کے لئے اس کے بانیوں کی نفسی کیفیت سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ محض ماحول جماعتی و ذہنی کی تشریح اس کے لئے کافی نہیں ہے:

کون نہیں جانتا کہ اشتراکیت جدید کی ذہنیت دراصل مارکس کی ذہنیت ہے۔ اس لئے اگر مارکس کی ذہنی و نفسی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو اس مذہب کی بہت سی خصوصیات کے سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی۔ لیکن مذہب اشتراک کے مؤرخ سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ مارکس اور اس کے رفیق انگلس کے خیالات کا اہم ترین حصہ خود ان کی اختراع نہیں، بلکہ ان سے پہلے اشتراکی مصنفوں کی تحریروں میں تقریباً وہ سب اصول ملتے ہیں، جو عام طور پر مارکس اور انگلس کے ساتھ مخصوص کئے جانے لگے ہیں۔ اشتراکیت کے فہم کے لئے ان اگلوں کی کیفیت نفسی کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔"

"مارکس ایک غیر معمولی ارادی قوت کا آدمی تھا۔ اس کے جذبات کی ساری شدت خارجی اعمال میں اظہار کے لئے بیتاب رہتی تھی۔ اپنے ذہن اور اپنی رائے کا پرتو خارج میں ڈالنے کی جو خواہش اس کی زندگی کی امتیازی خصوصیت ہے اس نے ایک "نفسیاتی قانون" یوں بیان کیا ہے:

'جب فکر انسانی خود اپنی پابندیوں سے آزاد ہو جاتی ہے تو وہ ارادہ کی شکل میں اس خارجی حقیقت دنیاوی سے برسرپیکار ہو جاتی ہے۔'

تو د مارکس کی زندگی میں یہ حقیقت خارجی تمام تر جماعتی زندگی سے عبارت تھی، یعنی یہ ان مصنوعی لوگوں میں سے تھا، جن کے نزدیک جماعتی زندگی کی قدر اعلیٰ ترین

۹۔ ڈمی اگرار فرفامننگ برٹش انڈینس (برطانوی ہند کا زرعی نظام)
جرمن زبان میں۔ افتتاحی مقالہ برائے سند ڈاکٹریٹ منظور شدہ شعبہ
فلسفہ فریڈرک ولیم یونی ورسٹی (برلن) یہ ڈگری ۶ مارچ ۱۹۳۰ء کو
ایوارڈ کی گئی:۔ ۱۳۸ ص

۱۰۔ معاشیات: مقصد اور منہاج: الہ آباد، ہندستانی اکیڈمی،
مارچ ۳۲، : ۱۰۹

۱۱۔ کساد بازاری: جامعہ، فروری ۳۴ء: ۱-۲۴
—— مقالہ کے ابتدائی حصہ میں اعداد وشمار سے یہ بتلایا گیا ہے کہ جنگ عظیم کو ۸-۷ برس نہ گزرنے پائے تھے کہ دنیا کی معاشی حالت فی الجملہ پہلے سے بہتر ہو چکی تھی۔ دولت آفرینی، تجارت، شرح منافع، شرح اُجرت، صرف اجناس، سب میں معتد بہ ترقی ہوئی تھی۔ اور ۲۹-۲۸ء کا زمانہ بہ حیثیت مجموعی ساری دنیا میں گرم بازاری کا زمانہ تھا۔ اور خصوصیت کے ساتھ امریکہ میں لیکن ۲۹ء سے ہوا کا رخ پلٹا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن دنیا کی معاشی زندگی سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ معیشت کے ہر شعبہ پر اس کساد بازاری کا جو گہرا اثر پڑا ہے اس کی تفصیل بھی مقالے میں اعداد وشمار دے کر کی گئی ہے۔ اس کے بعد کساد بازاری کے اسباب وعلل پر بحث ہے۔

۱۲۔ تنقید و تبصرہ: جامعہ، ۱(۲) مئی ۳۴ء: ۱۶۳-۱۶۹

۱۳۔ کیپٹل ازم:۔ یہ مقالہ ۵-۶-۷ مارچ ۳۲ء کو ہندستانی اکیڈمی الہ آباد یو۔پی میں پڑھا گیا

۱۳/۱۔ اسپیچ ان انڈرسٹینڈنگ: ۱۹۴۴ء
—— دہلی یونیورسٹی میں دیئے گئے خطبات، جنھیں ایشیا نے ان کے نائب صدر ہونے کے بعد ۱۹۶۲ء میں چھاپا۔ یہ پہلی بار ۱۹۴۸ء میں چھپے تھے۔

۱۴۔ معاشیات قومی: کتاب منزل لاہور، مارچ ۱۹۴۲ء: ۶۰۷ ص
—— فریڈرش لسٹ کی جرمن زبان میں کتاب سے ترجمہ۔ شروع میں بیٹے کی

ایک دلکش سوانح عمری؛ پوری کتاب کی اہمیت پر بحث۔

—— مقدمہ سے: "مشہور جرمن معاشی فریدرش لسٹ کی مشہور کتاب کا ترجمہ اُردو پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ یہ ترجمہ کئی سال ہوئے کیا تھا۔ خیال تھا کہ معاشیات کی چند مستند کتابوں کا ترجمہ اُردو میں ہو جائے۔ انگریزی کتابوں کے ترجمے ہو رہے تھے؛ سوچا کہ کچھ جرمن کتابیں بھی ترجمہ ہو جائیں تو اچھا ہے۔ یہ ترجمہ کیا۔ لیکن اسے اب تک شائع کرنے کی نوبت نہ آئی۔ اس لئے اور کسی کتاب کی باری نہ آسکی۔ اتفاق دیکھئے کہ اس کتاب کی اشاعت کی صورت ۴۶ء میں نکلی؛ اس کے مصنف نے شدید علالت اور آلام روزگار سے تنگ آکر جون ۴۶ء میں خودکشی کر لی تھی۔ یہی نہیں بلکہ جس جرمن قوم کی معیشت کی تعمیر میں اس کا حصہ کسی سے کم نہ تھا، وہ بھی قیادت عالم کے جوے میں اپنے وجود قومی کی بازی لگا کر ہار چکی ہے؛ لوگ کہتے ہیں اس نے بھی خودکشی کر لی!"

۱۵۔ معاشی دنیا: جامعہ، ۴۴ (۴) اپریل ۴۷ء: ۳۷-۴۱

—— ٹائم کوارٹرلی اپریل ۴۷ء میں ہندستان کی موجودہ حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے مختلف ممالک میں جنگ ختم ہونے کے بعد جو کچھ ہوا اس کا ایک مفید خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ مضمون اسی سے ماخوذ ہے۔

۱۶۔ معاشیات اور جمہور: ۲۲ جنوری کو براڈکاسٹ آواز، اپریل ۴۳ء

عام خطبے

۱۔ سعودی عرب میں ایک خطبہ: مسلم یونیورسٹی گزٹ ۱۹۵۳ء

سعودی عرب میں مقیم ہندستانیوں کی طرف سے دیئے گئے ایک استقبالیہ کے موقع پر۔

۲۔ وائس چانسلر کا خطبۂ استقبالیہ: چانسلر طاہر سیف الدین صاحب علیگڈھ میں ورود پر: ۱۹۵۴ء

۳۔ علیگڑھ کے طلبا کی یونین الوداعی تقریب۔

علیگ، علی گڑھ ۱ (۲)، ۲۵ر ستمبر ۵۶ء : ۷

۴۔ خانۂ فرہنگی (ایرانی کلچر ہاؤس) میں تقریر۔ آجکل، دہلی۔

۱۵ (۱۰) مئی، ۵۷ء : ۵ - ۷

—— ۱۲ر فروری، ۵۷ء کو دہلی میں ایرانی کلچرل مرکز کے افتتاح کے موقعہ پر ہند اور ایران کے تعلقات پر بصیرت افروز تقریر

۵۔ محبت، خدمت اور اقدار روحانی کی چاکری۔

"نیا خواب" رامپور ۱ (۵) ۱۶ر نومبر ۶۲ء : ۳

—— عرس حضرت نظام الدین اولیاء کے موقعہ پر ۱۷ر ستمبر ۶۲ء

۶۔ خطبۂ افتتاحیہ، سیمینار انڈین نیشنل کمیشن فار یونیسکو، نئی دہلی

۲۸ر ستمبر ۶۲ء

۷۔ گوشمور داں ہفتہ کے موقع پر نشری تقریر ۲۹ ستمبر ۶۲ء

۸۔ مولانا آزاد میڈیکل کالج فاؤنڈرس ڈے پر تقریر ۲۴ر اکتوبر ۶۲ء

۹۔ کرنٹ پبلک ریلیشنس آف کورپوریشن لا، مینجمنٹ اینڈ پریکٹس، پر سیمینار کے موقعہ پر تقریر ۱۱ر نومبر ۶۲ء

۱۰۔ فاؤنڈرس ڈے۔ موڈرن اسکول کے فاؤنڈرس ڈے کے موقعہ پر تقریر۔ ۱۰ر نومبر ۶۲ء

۱۱۔ قوم کے نام۔ نشری تقریر۔ ۳۰ر نومبر ۶۲ء

۱۲۔ قاہرہ میں ایک لیکچر : ۶ر اپریل ۶۳ء

۱۳۔ آندھرا مہیلا سبھا، حیدرآباد کی نئی عمارت کا افتتاح کرتے ہوئے تقریر۔ ۱۷ر مئی ۶۳ء

۱۴۔ تھرڈ چلڈرنس لیبرٹری کانفرنس، مدراس کے افتتاح کے موقعہ پر تقریر۔ ۲۰ر مئی ۶۳ء

۱۵۔ سوامی ویویکانند کے یوم پیدائش کی تقریبات، کوئمبٹور، بمبئی تقریر۔ ۳۰ر جولائی، ۹ر نومبر ۶۳ء

۱۶۔ ٹیچرس ڈے کے موقعہ پر نشری تقریریں ۵ ستمبر ۶۲ء، ۶۴ء، ۶۶ء

۱۷۔ دون اسکول دہرہ دون میں ایک تقریر، ۲۰ اکتوبر ۶۳ء

۱۸۔ وی، وی، آر، آئی، ہوشیار پور میں ایک تقریر، ۳ نومبر ۶۳ء

۱۹۔ سنٹرل الیکٹرو کیمیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، کرائے کوڈی میں ایک تقریر، ۲۲ جنوری ۶۴ء

۲۰۔ ساؤتھ ایسٹ ایشین ورکشوپ آف ورلڈ یونیورسٹی سروس بمبئی، افتتاحیہ خطبہ، ۲ مئی ۶۴ء

۲۱۔ جواہر لال نہرو کے انتقال پر تقریر: ۲۹ مئی ۶۴ء

۲۲۔ ڈاکٹر کے۔ جی۔ سیدین صاحب کے ۶۰ سالہ یوم پیدائش کے موقعہ پر تقریر۔ ۱۶ اکتوبر ۶۴ء

۲۳۔ پوپ پال کا بمبئی میں خیر مقدم کرتے ہوئے تقریر۔ ۲ دسمبر ۶۴ء

۲۴۔ وی۔ وی۔ گری کی سترویں سالگرہ کے موقعہ پر تقریر، ۲۰ جنوری ۶۵ء

۲۵۔ بین الاقوامی بچوں کی آرٹ نمائش کا افتتاح۔ ۱۹ مارچ ۶۵ء

۲۶۔ قوم سے خطاب: نشری تقریر، ۸ ستمبر ۶۵ء: آواز، ۱۷ اکتوبر ۶۵ء

۲۷۔ صدارتی تقریر سیمینار "مذہب اور سماج" انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز شملہ۔ ۲۰ اکتوبر ۶۵ء (انگریزی)

۲۸ ماؤلنکر میموریل لیکچر، احمد آباد "اخلاق اور ریاست" فروری ۶۶ء (انگریزی)

۲۹۔ خاندانی منصوبہ بندی ہفتہ کے موقع پر نشری پیغام ۱۷ دسمبر ۶۵ء

۳۰۔ ویمین گریجویٹس یونین، یونی ورسٹی بمبئی، سلور جوبلی تقریبات پر تقریر۔ ۱۹ فروری ۶۶ء

۳۱۔ دارالمصنفین کا خطبہ: ۱۹۶۶ء

۳۲۔ سمپوزیم۔ افریقہ اور ایشیا کا تعاون سائنس اور ٹکنیکی توسیع اور ترقی میں۔ تقریر، ۲۵ اپریل ۶۶ء

۳۳۔ نہرو اینڈ دی ماڈرن ورلڈ: جواہر لال نہرو پر انٹرنیشنل

راؤنڈ ٹیبل : ستمبر ٦٦ء (یونسکو، ١٩٦٧ء)

٣٤۔ دی نیو کیریکولم اینڈ فارن پالیسی پر سیمینار، افتتاحی تقریر، ۷ نومبر ٦٦ء

٣٥۔ ایڈریس، انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈی شملہ۔
١١ نومبر ٦٦ء۔ انسٹی ٹیوٹ بلیٹن، ١ (٢)، ٦٧ء : ٤ ص (انگریزی)

٣٥ الف۔ ماڈرن کالج فار ویمین، ڈیفنس کالونی نئی دہلی:
اینوئل ڈے فنکشن، تقریر، ٢١ نومبر

٣٦۔ انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں تقریر ٣١ دسمبر ٦٦ء

٣٧۔ آل انڈیا ریڈیو سے نشری تقریر، ١٠ جنوری ٦٧ء

٣٨۔ گورو گوبند سنگھ کی ٣٠٠ سالویں سال گرہ۔ نشری تقریر، ١٦ جنوری ٦٧ء

٣٩۔ خطبۂ افتتاحیہ مشی گن یونیورسٹی: "قومی ریاست ایک اخلاقی وجود کی حیثیت سے" ٢٩ اپریل ٦٧ء (انگریزی)

٤٠۔ صدر جمہوریہ کا خطبۂ اولین: مئی ٦٧ء ہندی، انگریزی)

٤٠۔ شاستری جی کو خراج عقیدت۔ آواز، ٢٢ جنوری ٦٦ء

٤١۔ یوم آزادی، نشری تقریر ١٤ اگست ٦٧ء

٤٢۔ ری پبلک ڈے، نشری تقریر ٢٥ جنوری ٦٧ء

٤٣۔ نذر ذاکر کی پیش کش کے موقع پر، تقریر ٦ مئی ٦٨ء

٤٤۔ گاندھی جینتی، نشری تقریر، یکم اکتوبر ٦٨ء

٤٥۔ یو۔ این ڈے میسج، نشری تقریر ٢٤ اکتوبر ٦٨ء

دیباچے، تقریظیں اور رائیں

١۔ امام غزالی (عمر الدین ٤٦ء)

٢۔ سوشل ایجوکیشن پر گاندھی جی کے خیالات (دیو پرکاش نیر، ٥٢ء)

٣۔ نذر سیدین (رشید عابد حسین، ٦٤ء)

٤۔ فکر انسانی کا سفر ارتقا (خواجہ غلام السیدین، ٦٦ء)

۵۔ نذرِ عرشی (مالک رام، ۶۶ء)
۶۔ انار کلی (ساغر نظامی)
—— ان میں سب سے دلکش تحریر "نذرِ رشید" میں شامل ہے جو انگریزی میں ہے۔

ملفوظات

۱۔ نجی گفتگو اور تقاریر:
مالیگاؤں میں ذاکر صاحب کی مصروفیات۔
اجمل بمبئی ۲، ۲۱، ۲۲ مئی ۴۵ء

۲۔ اقوالِ زریں،
"نیا خواب" رامپور ۱ (۹)، ۱۶ جنوری ۶۴ء : ۳

۳۔ ملفوظات کی ایک بڑی تعداد عبدالغفار مدھولی نے "ایک معلم کی زندگی" میں نقل کی ہے اور اس لحاظ سے یہ کتاب بڑا اہم ماخذ بن گئی ہے۔
—— مثال: "گھٹ گھٹ کیے جائیے تو کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا ہے۔"

مکاتیب

۱۔ ڈاکٹر عابد حسین کے نام ایک مکتوب: جامعہ ۳۲ (۵) نومبر ۳۹ء: ۸۰-۸۴ یورپ کے سفر کے دوران جنیوا سے، ۱۱ ستمبر ۳۹ء

۲۔ یہ ذاکر صاحب کا مکتوبِ گرامی جو آنکھوں کے آپریشن کے بارھویں دن عابد صاحب کو لکھا گیا تھا۔ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی، مگر دل کی آنکھیں روشن تھیں۔ ہاتھ کی جنبش بصارت کی مدد کے بغیر بصیرت کا پیام پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کاغذ پر ٹیڑھے میڑھے نقش بنے اور آپس میں گڈمڈ ہو گئے بڑی مشکل سے پڑھے گئے مگر پڑھ لئے گئے۔ یہ خط جنیوا سے ۱۹ جون ۱۹۴۸ء کو لکھا گیا تھا۔ (نئی روشنی، ۲۴ اگست ۴۸ء)

"عابد صاحب
آج شاید بارھواں دن ہے کہ دونوں آنکھیں بند اس بیمارستان میں بستر

پڑا ہوں اور کروٹ لینے کی بھی اجازت نہیں، اس وقت رات ہے۔ نہ
جانے کیا بجا ہوگا۔ تاریکی اور روشنی کے ادل بدل سے ناآشنا کو اس کا پتہ
اس سناٹے سے چلتا ہے جس میں قریب کا دریا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے
کمرے کے نیچے آگیا ہے اور بس مجھ سے ہی باتیں کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ میں
اس کی سنتا رہوں، مگر میرا جی چاہتا ہے کہ اس وقت آپ سے باتیں کروں۔
بستر سے لگی ایک چھوٹی سی میز ہے، جسے چھو سکتا ہوں، اور ٹٹول کر اس پر
سے چیزیں اٹھا سکتا ہوں۔ اس کی دراز میں آپریشن سے پہلے ایک پنسل اور
کاغذ ایک پیڈ رکھ دیا تھا وہ اس وقت کام آیا۔ نابینا آنکھوں کے باوجود
لکھنے کی یہ پہلی کوشش ہے۔ سطر پر سطر تو شاید چڑھ جائے مگر کچھ نہ کچھ تو
پڑھا جائے گا ضرور۔!

۳۔ ہم کیا کریں؟: ایک دوست کے خط کے بنیادی سوال کا جواب:
نئی روشنی دہلی، ۱۰ تا ۱۲، ۸ ستمبر ۴۸ء: ۲

ایک دوست لکھتے ہیں:-
"جب اوپر سے ایٹم بم پھٹ کر اور اندر سے باہمی نفرت کا جوالا مکھی بھڑک کر
دنیا کو برباد کرنے پر تلا ہوا ہے، آدمی کس امید پر تعمیری کام میں جان کھپائے؟
تھوڑے سے سرپھروں کی تعمیری قوت کس طرح ان ہولناک تخریبی قوتوں
کا مقابلہ کر سکتی ہے؟"
(یہ مضمون ان بنیادی سوالوں کا فاضلانہ جواب ہے۔)
"نتیجہ یہ ہے کہ اس سوال کا اٹھنا ہی اس کے شرف انسانیت کی خبر دیتا ہے۔
مایوسی اور امید، خوف اور رجا کے بیچ سے ایمان کی ڈگر پر پڑ لینا انسانیت کی
خصوصیت ہے — ایمان ان مطلق قدروں پر جن کی تصدیق اس کا ضمیر
کرتا ہے۔

۴۔ آل احمد سرور کے نام ایک مکتوب: رضا کالج میگزین ۵۸ء

۵۔ ہم کیا کریں: ایک دوست کے مرکزی سوال کا جواب: نئی روشنی دہلی ۱۶۱)
۸، اکتوبر ۴۸ء: ۲
"ہندستان کے مسلمانوں پر معاش کی راہیں تنگ ہوتی جاتی ہیں۔ آپ

کی رائے میں اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے کیا تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں ؟"

یہ ڈاکٹر صاحب کے ایک دوست کے خط کا مرکزی سوال تھا جس کا جواب بڑی تفصیل کے ساتھ اس مضمون میں دیا گیا ہے

" تعلیم کی توسیع کے ساتھ دوسروں کی طرح مسلمانوں کے بھی سب قابل نوجوان سرکاری ملازمت میں نہیں کھپ سکیں گے۔ انھیں دوسری چیزوں کی طرف بھی قدم اٹھانا ہوگا۔ طب اور انجینیری کے پیشے ان کی ملازمت پرستی کی بدولت ان سے خالی خالی سے ہیں۔ ادھر تیز تیز قدم بڑھانا چاہیئے۔ تجارت کے میدان میں بعض مخصوص مسلم گروہوں کے سوا تعلیم یافتہ لوگ جاتے ہی نہیں۔ ادھر رُخ کرنا چاہیئے۔ تعلیم کے پیشے کو وسیع پیمانے پر اپنانا چاہیئے اور ان کاموں میں امتیاز حاصل کر کے آگے آنے والوں کے لیے اچھی روایتیں قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ابتدائی مجبوری وقتوں کو سر کرنا تو ہوگا، مگر یہ سب سر ہو سکتی ہیں۔ محنت اور ہمت کی ضرورت ہے۔"

۶۔ رشید شروانی کے نام ایک مکتوب :

" علی گڑھ کے نام ذاکر صاحب کا پیام" ۲۰ءنیا خواب رامپور علیگڈھ نمبر ۶۳ء

" میرا خیال ہے کہ علی گڈھ میں خود علی گڈھ والے علیگڈھ کی خیر خواہی کے پیش پر دو قسم کے متضاد الزام لگاتے ہیں۔ بعض خیر خواہ کہتے ہیں کہ یہ کمیونسٹوں کا اڈہ ہے۔ دوسرے خیر خواہ کہتے ہیں کہ یہ پاکستانیوں کا گڑھ ہے سننے والے اور کان دھر کر سننے والے دونوں کو مل جاتے ہیں اور وہ اپنا کام یہ نہیں سمجھتے کہ اطلاع میں فرقہ وارانہ عصبیت کو دخل ہونے کی وجہ سے کوئی مبالغہ ہے یہ مبالغہ بلا ارادہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہر فریق آنکھوں پر ایک رنگین عینک چڑھا لیتا ہے جس نے سبز عینک لگائی اسے سب سبز ہی سبز دکھائی دیتا ہے جس نے لال عینک لگائی اسے لال ہی لال دکھائی دیتا ہے اور لوگ ان کے ادراک کو بڑی خوشی سے تسلیم کر لیتے ہیں۔

علیگڈھ والوں کو اس معاملے میں خود سوچنا چاہئے کہ وہ اس طرح علی گڈھ کی خیر خواہی نہیں کرتے، اسے اکھاڑنے کا انتظام کرتے ہیں۔"

۷- دلچسپ خطوط: بین الاقوامی تعلیمی کانفرنس، لندن کے لیے سفر کے موقع پر

۱ مجیبہ صاحبہ کے نام، جودھپور اور کراچی کے درمیان، ۲۳ اکتوبر

۲ عابد صاحب کے نام، کراچی اور بحرین کے درمیان، ۲۴ اکتوبر

۳ مسعود علی صاحب کے نام، بحرین سے، ۲۴ اکتوبر

۴ مجتبیٰ صاحب کے نام، لندن سے، ۲۸ اکتوبر

(ہمدرد جامعہ، نومبر، دسمبر ۵۴ء)